نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ر تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مُفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (ے ر)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (ے ر) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد — ۳۲	فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۳۷ء	شمار — ۲

ملاحظات ---------- ۲

ابونواس ---------- جلیل الرحمان اعظمی ---------- ۹

محبت کا مزار ---------- مجنوں گورکھپوری ---------- ۲۰

مسایلِ زر جدید روشنی میں ---------- عبدالرحیم شلبی (بی۔کام) ---------- ۳۲

چند خطوط ---------- اختر انصاری (بی۔اے) ---------- ۴۲

اسفارِ موسیٰ علوم جدیدہ کی روشنی میں ---------- ۴۸

مکتوبات نیاز ---------- ۵۵

علم الاصنام پر ایک اجمالی تبصرہ ---------- ۵۹

اپنے رنگ سے ہٹ کر ---------- ۶۵

باب الاستفسار ---------- ۷۱

منظومات ---------- فضل الدین اثر - نبی احمد - عدم - تمکین سرمست - خاور - فطرت ---------- ۷۴

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

معاون:— جلیل اعظمی

جلد — ۳۲	اگست سنہ ۳۷ء	شمار — ۲

ملاحظات

اعتبار و بصیرت

عروج و زوال دونوں حالتوں میں، بعض ایسی ساعتیں بھی آیا کرتی ہیں جو اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہیں، پھر قومیں اس سے فایدہ و بصیرت حاصل کریں یا نہ کریں لیکن وہ اپنا فیصلہ سنا جاتی ہیں، اُبھرنے والے اُبھر آتے ہیں اور مٹنے والے مٹ جاتے ہیں۔

قدرت بخیل ہو یا فیاض، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ موقعہ دئے بغیر نہ وہ کسی سے کچھ چھینتی ہے، نہ بغیر استحقاق دیکھے ہوئے وہ کسی کو کوئی چیز عطا کرتی ہے۔ اگر اس نے اکاسرۂ عجم کے ہاتھ سے تخت کیانی چھین لیا تو بلاوجہ نہیں اور "شیرِ شتر" پینے والے اور "سوسمار" کھانے والے عربوں کی دھاک شرق سے غرب تک بٹھادی تو اس کا بھی سبب موجود تھا۔

روما کو اس نے تباہ نہیں کیا جب تک نیرو وہاں پیدا نہ ہوا اور یونان کی عظمت اس نے قایم نہ ہونے دی جب تک سکندر اس سرزمین سے نہ اُٹھا۔ فطرت سخت بے نیاز ہے، اس حد تک بے نیاز کہ اسے ہم بے حس سنگدل، ظالم سبھی کچھ

کہہ سکتے ہیں، لیکن اسباب موجود ہوں اور وہ نتیجہ نہ پیدا کرے ممکن نہیں۔

چنانچہ یہی وہ رمز ہے جس کو شارع اسلام نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے۔ پھر یہ تبدیلی کیا چیز ہے۔ اس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ حالات حاضرہ کو دیکھا جائے اور قدرت کی طرف سے جو اُصولِ کار مقرر ہیں اُن پر کاربند ہونے کی کوشش کی جائے۔

انسان کی حقیقی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ زمانہ کے اقتضاء کے موافق اپنے آپ کو ڈھال لینے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے اور اسی لئے انسان کی بہترین تعریف اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ "سیاسی حیوان" ہے۔

قوم جو حقیقتاً عبارت ہے ایک مشترک احساس اجتماعی سے، صرف اسی وقت ابھر سکتی ہے جب یا تو عام تعلیم ہونے کی وجہ سے خود افراد میں یہ احساس پیدا ہو جائے، یا قوم کے رہنما خلوص و صداقت سے کام لیکر تمام افراد کو کسی ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیں، اس لئے اگر کوئی قوم ایسی ہو جس میں ان دونوں باتوں کا فقدان ہو تو اس کے زندہ رہنے کی کیا صورت ہے اور غالباً غلط نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ہندوستان کی مُسلم جماعت بدقسمتی سے اسی دورِ مایوسی سے گزر رہی ہے۔

عام مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، بڑا حصہ تو اُن افراد کا ہے، جو صرف اس افتخار پر زندہ ہیں کہ وہ اُمتِ محمدی میں شامل ہیں اور "الفقر فخری" جس کا دوسرا نام بہ لحاظ تمنا حور و قصور یا کوثر و سلسبیل ہے، ان کا تنہا نصب العین ہے یہ جماعت اپنا رہنما صرف ان علماء عظام و صوفیاء کرام کو سمجھتی ہے جو اسے بھوک دور کرنے کی تدبیر نہیں بلکہ بھوکا رہنے کے برکات بتاتے ہیں جو اسے دُنیا کی نعمتیں حاصل کرنے کی نہیں بلکہ تمام لذائذ تج دینے کی راہ پر چلانا چاہتے ہیں اور جن کا فلسفہ "قیدِ حیات و بندِ غم" کو ایک ہی چیز سمجھنا اور سمجھانا ہے، جب یہ کسی قوم کو دماغی و علمی ترقی کرتے دیکھتے ہیں تو انھیں تکلیف ہوتی ہے اور جب کوئی اختراع ذہنی و عقلی ناکام رہتی ہے تو یہ خوشی سے اُچھل پڑتے ہیں۔ جب جرمنی اپنا زبردست ہوائی جہاز طیار کرتا ہے تو وہ خاموش غیظ و غضب کے ساتھ اسے دیکھتے رہتے ہیں لیکن جب اتفاق سے اسمیں آگ لگ جاتی ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے سبوحٌ قدوسٌ کی تسبیح جاری ہو جاتی ہے، جب امریکہ میں دو سو میل کی رفتار سے چلنے والا انجن بنایا جاتا ہے تو وہ خون کا سا گھونٹ پیکر رہ جاتے ہیں لیکن جب سوء اتفاق سے وہ اُلٹ جاتا ہے تو خوشی سے اُچھل پڑتے ہیں اور خدا کی عظمت و جبروت کی داستان دہرانے لگتے ہیں۔ الغرض قدرت کبریائی وہ انسان کی ذہنی ترقیوں میں نہیں پاتے بلکہ صرف حوادثِ روزگار اور انحطاط انسانی میں پنہاں پاتے ہیں۔ اور ان کی تمنا یہی ہے کہ جس طرح آدم و حوّا (ان کے اعتقاد کے مطابق) بالکل بے برگ و بار حالت میں زمین پر آئے تھے اسی طرح ان کی اولاد بھی رہے اور اقدام ترقی کے گناہ میں مبتلا نہ ہو۔[1]

---

[1] اس نوع کے مواعظ اگر دیکھنا ہوں تو معاصر صدق ملاحظہ کیجئے، جس میں سوائے اس "ہائے ہائے" کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جس کے ایک ایک فقرے سے وہ غلامانہ رشک و حسد ٹپکتا ہے جسے انگریزی میں (Poor man's Consolation) کہتے ہیں۔

ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ مذہب اسلام کا تبع ہو اور انھیں مراسم و شعایر ظاہری کے ساتھ جو اب سے صدہا سال قبل کے فقہا و علماء نے متعین کر دئے تھے، اس لئے وہ نہ صرف یہ کہ سوائے اپنے تمام نوع انسانی کو مردود و مقہور سمجھ کر اس سے نفرت کرتی ہے بلکہ خود اپنی جماعت کے بھی اُن افراد سے متنفر ہے جو ان کی طرح وحشیانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک قلب کی صفائی اتنی ضروری نہیں ہے جتنا داڑھی کا وجود، وہ اخلاق کی پاکیزگی کو بیکار خیال کرتے ہیں اگر پیشانی پر "اثر سجود" کا سیاہ نشان نہیں ہے۔ انھیں مطلق پرواہ نہیں اگر دوسری قومیں ان کے ذریعۂ رزق کو چھین لیں، کیونکہ بغیر فقر و فاقہ کی تنگی کے وسعت فردوس کا حصول ان کے نزدیک ممکن نہیں، اگر غیروں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت انھیں چھیڑے لگائے پھرنے پر مجبور کرتی ہے، تو وہ اس کو خداوندی آزمایش و ابتلا پر محمول کر کے خوش ہوتے ہیں کیونکہ حلہ ہائے بہشت بغیر اس دنیاوی نکبت و ذلت کے میسر آ ہی نہیں سکتے۔

جس وقت ان کے سامنے اس بے سر و سامانی کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اس کے جواب میں عمر فاروق کو پیش کرتے ہیں جنھوں نے بیت المقدس کو اسی حال میں فتح کیا تھا کہ ان کی قمیص میں ٹاٹ کے پیوند لگے ہوئے تھے، لیکن کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ عمر فاروق کی پیوند لگی ہوئی قمیص کے نیچے بھی وہی دل دھڑک رہا تھا جو ان لوگوں کے سینوں میں پایا جاتا ہے اور کیا عمر فاروق کا ذہن بھی اسی گدایانہ توکل اور غلامانہ صبر و شکر کا، دی تھا جو ان حضرات کی زندگی کا سہارا ہے۔ اُن کا فقر و فاقہ اس لئے نہ تھا کہ وہ اس پر مجبور تھے بلکہ اس کی بنیاد جذبۂ ایثار پر قایم تھی، ان کا عیش و تنعم سے علٰحدہ ہونا اس وجہ سے نہ تھا کہ اس کے اسباب وہ فراہم نہ کر سکتے تھے، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان چیزوں کو عملی زندگی کے منافی سمجھتے تھے اور اُصول اشتراکیت کے خلاف۔ اُن کی بے سر و سامانی وہ تھی جس نے اکاسرۂ عجم کو سرنگوں کر دیا تھا اور ان کی بے برگ و باری وہ ہے جو تخت و تاج کھو دینے کے بعد ایک غلام قوم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ الغرض ہماری قوم کا ایک بڑا حصہ ان گمراہ علماء سوء و صوفیاء نفس پرست کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے اور کوئی امید اس کے سنبھلنے کی نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ، جدید تعلیم یافتہ جماعت کا ہے اور اس کی حالت اور زیادہ بدتر ہے۔ مذہبی جماعت خواہ وہ کتنی ہی گمراہ ہو پھر بھی ایک بیک گرونڈ رکھتی ہے اور صحیح یا غلط مرکزیت حاصل کرنے کی صلاحیت اس میں موجود ہے، لیکن اس طبقہ کے انتشار کا یہ عالم ہے جیسے آندھی آئے اور خاکستر کے ذروں کو اڑا لیجائے۔ ان کو مطلق معلوم نہیں کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں اور ان کی منزل کیا ہے۔ وہ اپنے کو مہذب و شایستہ کہتے ہیں صرف اس دلیل پر کہ وہ کوٹ پتلون پہنتے ہیں، اپنے آپ کو آزاد خیال کہتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ حفظ مراتب کے اُصول سے بیگانہ ہیں اور اپنے تئیں تعلیم یافتہ ظاہر کرتے ہیں محض اس لئے کہ انھوں نے یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لی ہے، درانحالیکہ وہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت پست، فکر و رائے کے معاملہ میں حد درجہ تنگ نظر اور علم و فضل کے باب میں یکسر ناقص و نامکمل ہیں۔ ان میں جو بعض افراد ملازمت حاصل کر لیتے ہیں، ان کی دنیا صرف ان کا دفتر اور ان کا خدا ان کا افسر ہوا کرتا ہے، ان کو مطلق اس کا ہوش

نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور بہ حیثیت ایک فرد نوع انسانی ہونے کے علاوہ دفتری فرایض کے کوئی اجتماعی فرض بھی ان پر عاید ہوتا ہے یا نہیں۔ رہگیا وہ حصہ جو حصول ملازمت کی کوشش میں سرگرداں ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا سو اس کی حالت نہ پوچھیے، اسکول و کالج کی زندگی میں اپنی بداعمالیوں سے وہ اپنے قوار فکر و عمل کو اس حد تک تباہ کر چکا ہوتا ہے کہ نہ اس میں پھاوڑا ہاتھ میں لیکر زمین کھودنے کی ہمت ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے دماغ سے کام لیکر زندگی کو مفید بنانے کی کوئی راہ سوچ سکتا ہے۔ وہ اپنی بیکاری سے پریشان ضرور رہتا ہے لیکن اس کی حس اتنی بلید ہوتی ہے کہ اصل راز کو سمجھ کر اس کے اندر کوئی حقیقی اضطراب پیدا نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ وہ جسمانی محنت کر کے اپنی اقتصادی مشکلات کو دور کر سکتا ہے نہ دماغ سے کام لیکن ان موانع سیاسی کا مقابلہ کر سکتا ہے جنھوں نے اس کی دین و دنیا کو خراب کر رکھا ہے۔ الغرض ایک موت کا سا جمود اس جماعت پر بھی طاری ہے اور تا وقتیکہ کوئی خارجی قوت بروئے کار نہ آئے اس کی اندرونی صلاحیت کسی طرح اس کو ابھارنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

ان دو جماعتوں کے علاوہ مسلمانوں میں ایک مختصر سی جماعت اور ہے جسے ہم نسبتاً باخبر کہہ سکتے ہیں، لیکن اسکی ہوشمندیوں کی داستان بھی کم درد انگیز نہیں۔ یونتو بظاہر یہ گروہ اصلاح اخلاق و معاشرت کی طرف بھی متوجہ نظر آتا ہے احساس اجتماعی کا اضطراب بھی اس میں پایا جاتا ہے، سیاسیات میں بھی حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے، قید و بند کی تکلیفیں بھی اُٹھانے کے لئے طیار ہے، لیکن یہ سب کچھ وہ اس زاویۂ نگاہ سے کرتا ہے جو خود اس کا نہیں بلکہ دوسروں کا ہے، وہ خود نہیں سمجھنا چاہتا کہ جس راہ پر چل رہا ہے وہ واقعی منزل تک پہونچانے والی ہے یا نہیں اور جن کے نقش قدم کو اس نے دلایل راہ بنایا ہے وہ واقعی رہبر بنائے جانے کے قابل ہیں یا نہیں؟

روایتی مذہب کی غلط پابندی نے جو کیفیت کورانہ تقلید کی اس میں پیدا کر دی ہے وہ اسے مطلق سوچنے نہیں دیتی اور وہ ہر راہرو کو رہبر سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔ وہ صرف ظواہر کا پرستار ہے اور نقد و تبصرہ کی کوئی قابلیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس لئے اس جماعت کی قسمت کا فیصلہ صرف اس پر ہے کہ اسے کوئی مخلص قاید و رہنما مل جائے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس لحاظ سے ہندوستان کی مسلمان قوم حد درجہ بدنصیب ہے۔

وہ دیکھتی ہے کہ جن کو اس نے ناخدا بنایا، انھوں ہی نے کشتی کو ڈبویا، وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ جن کو اس نے چارہ ساز سمجھا، وہی ہمیشہ اشتداد مرض کا سبب بنے، لیکن نہ وہ ان کا دامن چھوڑتی ہے اور نہ یہ اس کی گردن۔ ترکی کی امداد کے بہانے سے قوم کو لوٹنے والے اب بھی قوم کے رہبر ہیں، خلافت کے نام سے تباہ کاریاں پھیلانے والے ہنوز ہمارے چارہ ساز ہیں اور اقلیت کا یزدلانہ خیال پیدا کر کے ہم سے ہمارا اعتماد چھین لینے والے اب تک ہمارے قاید و رہنما بنے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں اسوقت تک جتنے لیڈر پیدا ہوئے ہیں، سوائے ایک آدھ کے سب کی سیاسیات کا نقطۂ نظر غیر ملکی رہا ہے

اور اسی لئے وہ فرقہ وارانہ جذبہ سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ انھوں نے ہمیشہ کھوئی ہوئی سلطنت کا خواب دیکھا اور اسی ملوکانہ انداز سے اپنا رشتہ ہندوؤں کے ساتھ جوڑنا چاہا، وہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے کے خیال سے ہمیشہ علٰحدہ رہے اور ایک اجنبی قوم کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فاتحانہ حقوق یہاں قایم کرنا چاہے، انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہندوں سے برتر سمجھا اور انھیں کافر و بت پرست قرار دیکر ایک نوع کا جذبۂ نفرت و حقارت ان کی طرف سے پیدا کیا، انھوں نے اپنے کو ہندوستانی کہلانا توہین سمجھا اور اپنے ناموں کے ساتھ قریشی، فاروقی، ہاشمی، صدیقی وغیرہ کی نسبت ظاہر کرکے ہمیشہ اپنے تفوق کی نمایش کی، سالس لیتے تھے وہ ہندوستان میں، زندگی بسر کرتے تھے یہاں کے بوئے ہوئے غلہ اور یہاں کے دریاؤں کے پانی پر، لیکن جان دیتے تھے حجاز و حجازیات پر۔

خود اندرون ملک کی تحریکوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن ترکی و عرب کے معمولی معمولی واقعات سے متاثر ہو جانا ان کے لئے ناگزیر تھا۔ پھر اس میں کلام نہیں کہ ہندوؤں کا کلچر ایسا نہیں کہ وہ مسلمانوں کو آسانی سے اپنے اندر جذب کر سکتا، لیکن مسلمانوں کی اس ذہنیت کو دیکھ کر ہندوؤں کی بیگانگی اور بڑھ گئی یہاں تک کہ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ملک کی آزادی کا سارا بوجھ انھیں خود ہی اُٹھانا ہے اور مسلمانوں سے کسی مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ہندوؤں میں خود اعتمادی پیدا ہو کر ان کے عزایم زیادہ اُستوار ہوتے گئے اور دوسری طرف مسلمانوں نے یہ محسوس کرکے کہ وہ اب ہندوؤں سے کسی رواداری کی توقع نہیں رکھ سکتے حکمراں جماعت کا دامن پکڑنا چاہا، اور اس طرح دنیائے سیاسیات میں وہ ایسے ذلیل جُرم کے مرتکب ہوئے جس کی مثال ہم کو صرف غداران وطن ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے

ہر چند مسلمانوں کو تحریک خلافت و تبلیغ اور خدام کعبہ وغیرہ کی تحریکات نے کافی سیاسی نقصان پہونچایا، لیکن سب سے زیادہ مضرت جس چیز نے پہونچائی وہ مسلم لیگ کا قیام تھا۔ اس جماعت کی تشکیل کا مقصود ہی ہندو مسلمانوں کے درمیان حد فاصل قایم کر دینا تھا اور چونکہ بنیادی جذبہ محض خوفِ اکثریت تھا اس لئے اس سے نہ صرف یہ ہوا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی بزدلی کا علم ہو گیا بلکہ یہ بھی کہ خود مسلمانوں کی مساعی نے وہی نوعیت اختیار کر لی جو ایک کم ہمت غلام قوم کی کوششوں کی ہوا کرتی ہے۔ مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ اپنے تحفظ کے لئے جو مطالبات وہ اکثریت کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ حکومت کے عین منشاء کے مطابق ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ان مطالبات کی بنیاد ہی حکومت کی ریشہ دوانیوں پر قایم ہوئی، وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اگر آج حکومت کے مصالح ان کو اس آواز کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہ ہوں تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن انھوں نے نہ اپنی قدیم روایاتِ خودداری کا لحاظ کیا نہ اپنی قومی علوئے ہمت کا۔

مسلم لیگ کی ہیئت ترکیبی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف مسلمانوں نے ہندوؤں سے یہ کہا کہ "تم ہم سے تعداد میں زیادہ ہو اس لئے ہمیں فنا کر دو گے"، اور دوسری طرف ارباب حکومت سے یہ کہا کہ "آپ نے اگر ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم مر جائیں گے"، اور مسلم لیگ وجود میں آگئی۔

ہر چند اس دوران میں کانگرس کی اہمیت اور اس اہمیت کے سامنے حکومت کے جھک جانے سے "مسلم لیگ" کو ایسی ضرب کاری پہونچی ہے کہ اب اس کے بقا کی کوئی امید باقی نہیں رہی، لیکن جب تک مسٹر شوکت علی اور مسٹر جناح ایسے مسیحا نفس موجود ہیں اس بیمار کو دم توڑنے کے لئے بھی کچھ دن اور درکار ہوں گے اور مسلمانوں کو قالین کے ان شیروں پر "شیر بیشاں" ہونے کا دھوکا ابھی کھانا ہی پڑے گا۔

اس سے قبل کسی اشاعت میں ہم مسٹر جناح و شرکاء کی پالیسی اور ان کے بزدلانہ مشوروں پر اظہار خیال کر چکے ہیں، اور اب اس کا احساس بھی مسلمانوں کو ہو چلا ہے، لیکن چونکہ ان بتوں کے قیام کو ایک زمانہ گزر چکا ہے اس لئے باوجود احساس بیداری کے بھی ان کے ٹوٹنے میں کچھ عرصہ لگے گا اور جب تک ان کو بار بار بے نقاب کر کے ان کے مکروہ خط و خال کو نمایاں نہ کیا جائے گا ان کی پرستش کسی نہ کسی گوشۂ ملک میں ضرور باقی رہیگی۔

جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں ان کی پالیسی صرف اس بے اعتمادی پر قایم ہے جو اکثریت کی طرف سے ان کے دل میں پیدا ہو گئی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو درست سمجھ لیں تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا صحیح علاج یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو برابر کمزور سمجھ کر دوسروں کی حمایت کے طلبگار رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسوقت دوسروں کے طفیل میں اقلیت و اکثریت کا توازن قایم رکھنے میں اس طرح کامیاب ہو جائیں، لیکن جب یہ سہارا بھی باقی نہ رہیگا (جس کا باقی نہ رہنا یقینی ہے) تو پھر کیا ہوگا۔

صحیح طریق علاج یہی ہے کہ اصل بیماری کو دور کیا جائے نہ یہ کہ بیمار کو اسی حالت مرض میں زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور مسلم لیگ کا تحفظ اقلیت کے لئے اکثریت سے عہد و پیمان لینا بالکل یہی دوسری صورت رکھتا ہے۔ بہ لحاظ آبادی مسلمانوں کی جماعت ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی اور ہمیشہ اقلیت میں رہیگی۔ لیکن اس کا علاج نہ انگریزوں کا دامن پکڑنا ہے نہ ہندوؤں سے رحم و کرم کی خواہش کرنا بلکہ اس کی تنہا تدبیر صرف یہ ہے کہ ہندوؤں سے زیادہ بلند سیاسی نصب العین قایم کیا جائے اور کمیت کی کمی کو کیفیت کی زیادتی سے پورا کیا جائے۔

دستور جدید کے نفاذ کے وقت جب کانگرس جماعت کو انتخاب میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو مسلمانوں کی آنکھ کھلی، اور ان کو شرکت کانگرس کا خیال پیدا ہوا، لیکن اگر وہ اس نیت کے ساتھ جا رہے ہیں کہ اس طرح اسمبلی کے ممبر بننے کا امکان زیادہ ہے یا یہ کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے تو ان کا کانگرس میں شریک نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ ضرورت ہے کہ جو شخص کانگرس میں شریک ہو وہ فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالکل پاک ہو اور اس کے سامنے ہندو مسلم تفریق کا سوال ہی نہ ہو۔ سیاسیات کا تعلق صرف ہیئت اجتماعی سے ہے اور اس کے لئے خاص اجتماعی نفسیات کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو مذہب وغیرہ سب سے بالاتر ہے اور جس کا نصب العین سوائے وطن پرستی کے اور کوئی نہیں۔

کانگرس اور دستورِ جدید

کانگرس کے ممبروں نے تشکیل وزارت سے انکار کرکے دستورِ جدید میں جو تعطل پیدا کر دیا تھا وہ اب دور ہو گیا ہے اور ہندوستان کے چھ صوبوں میں وزارتِ کابینہ کی کوٹھیوں پر قومی جھنڈا لہرا رہا ہے، ہر چند دستورِ جدید قومی مطالبات کے لحاظ سے صفر کا درجہ رکھتا ہے، لیکن پھر بھی اب سے چند سال پیشتر کون اس کا یقین کر سکتا تھا کہ کونسل ہال میں بجائے کرسیوں کے دری کا فرش نظر آئے گا اور کوٹ پتلون والوں کی جگہ کھدر پوش لے لیں گے۔

یوپی میں کانگرس کی وزارت نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور سیاسی مقدمات کا اُٹھا لیا جانا ہے اور یقیناً یہ اقدام بہت شاندار ہے، اس کے بعد جو اصلاحات شروع ہوں گی ان کی ترتیب کے متعلق کوئی صحیح رائے نہیں دی جا سکتی لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے پہلے کاشتکاروں کی طرف توجہ کی جائے گی اور ان کی مشکلات کو دور کیا جائے گا، اسی کے ساتھ نظام تعلیم پر غور کیا جائے گا کہ وہ ملک کے حالات کے لحاظ سے کیا تبدیلیاں چاہتا ہے۔

سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ میں ابھی سے ہلچل پیدا ہو گئی ہے، کیونکہ کانگرس اپنا نقطۂ نظر ان دونوں جماعتوں کے باب میں بارہا صاف الفاظ میں ظاہر کر چکی ہے اور اب وقت آیا ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو دائرۂ عمل میں لائے۔

اسوقت تک گورنر کی طرف سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس سے کانگرس کی مخالفت کا اظہار ہو، اور نہ اس کا کوئی موقعہ پیش آیا، لیکن اس آزمایش کا وقت بھی جلد آنے والا ہے اور ایوان ادنیٰ و ایوان اعلیٰ کے اجلاس کے بعد اس کشمکش کا آغاز ہو گا اگر گورنر اور کابینہ میں کوئی شدید اختلاف پیدا ہوا۔ زیادہ سنجیدہ لوگوں کی رائے ہے کہ کابینہ کو بہت سوچ سمجھکر قدم بڑھانا چاہئے اور تدریجی طور پر اصلاحات کا نفاذ کرنا چاہئے، لیکن یہ مشورہ اسوقت مفید ہوتا جب کانگرس کا نقطۂ نگاہ دستورِ جدید کو کامیاب بنانا ہوتا، لیکن جب اس کا مدعا اس کو درہم برہم کرنا ہے جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے تو پھر معاملہ کی صورت "صلاح کار و من خراب" کی سی ہو جاتی ہے، جہاں مصلحت بینی و دور اندیشی صرف ایک صید زبوں کی حیثیت رکھتی ہے

امامت و خلافت

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں اس موضوع پر مولوی ابو سعید بزمی ایم۔ اے کا مضمون شایع ہو چکا ہے جس میں "آزاد خیال شیعی عالم" کے مقالہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آیندہ مہینے ایک اور "سنی عالم" کا مضمون شایع کیا جائے گا، جو دلایل کے لحاظ سے اتنا ہی اہم ہے جتنا پہلا مقالہ۔

میں نے جو گیارہ تنقیحیں قایم کی تھیں ان میں سب سے زیادہ اہم تنقیح یہ تھی کہ خلافت حضرت علی منصوص من اللہ ہے یا نہیں، اگر ہے (جیسا کہ حضرات شیعہ کا عقیدہ ہے) تو پھر بحث کے اور تمام پہلو بیکار ہو جاتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ سنی حضرات اسے تسلیم نہ کریں، لیکن اگر منصوص نہیں ہے تو بیشک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے اہم مسئلہ کو خدا نے کیوں غیر منفصل رکھا۔

جناب بزمی نے بھی روایتاً و درایتاً خلافت حضرت علی کے غیر منصوص ہونے پر اظہار خیال کیا ہے اور آیندہ جو مقالہ شایع ہونے والا ہے اسکا موضوع بھی یہی ہے۔ اسلئے شیعی علماء سے درخواست ہے کہ وہ اس دوسرے مقالہ کو ملاحظہ فرمانے کے بعد جواب کی طرف متوجہ ہوں امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ نومبر تک دونوں جانب کی بحث ختم ہو جائے گی اور دسمبر کے نگار میں مجھے اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقعہ مل سکیگا۔

۱۔ یارب ان عظمت ذنوبی کثیرۃ
فلقد علمت، بانّ عفوک اعظم

خداوندا! اگرچہ میرے گناہ بہت بڑے اور بہت زیادہ ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ تیرا "عفو" اُس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔

۲۔ ان کان لایرجوک الاّ محسنٌ
فبمن یلوذ و یستجیرُ المجرم،

اگرچہ تجھ سے امید نیکوکار ہی کو ہونا چاہیئے،
لیکن گنا بگار پھر کس کی پناہ چاہے؟

۳۔ ادعوک ربّ کما امرت تضرعًا
فاذا ردت یدی فمن ذا یرحم

اے خدا میں تجھے پکارتا ہوں عاجزی کے ساتھ جیسا کہ تو نے حکم دیا ہے
اگر تو نے میرے ہاتھوں کو محروم واپس کیا تو کون ہے جو مجھ پر رحم کریگا۔

۴۔ مالی الیک وسیلۃٌ الا الرّجاء
وجمیل عفوک ثم انی مسلمُ

سوائے امید اور تیرے کرم کے میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، ہاں! میں مسلمان بھی ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اُس نے مرنے سے کچھ پہلے خدا کی جناب میں ایک معذرت نامہ بھی مرتب کیا تھا اور وصیت کی تھی کہ وہ کفن کے ساتھ اُس کی قبر میں رکھدیا جائے، اُس کا آخری مصرعہ یہ تھا:۔

"فَعُذرِی اِقرَارِی بِاَنّ لَیسَ لی عُذرُ"

جلیل الرحمٰن اعظمی

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارن پور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حُسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ اور متحد المضامین اشعار درج ہیں، عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مصرعہ:۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت معہ محصول ڈاک عہ ۸ ضخامت ۲۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

محبّت کا مزار

(۱)

رشید نے رسم و رواج کی پابندی کو ہمیشہ انسان کی جہالت اور خود فریبی سے تعبیر کیا۔ زبان سے رسم و رواج کو لغو اور بے معنے کہنے والوں کی تعداد کبھی کم نہیں رہی ہے۔ لیکن رشید ان ریاکاروں میں نہ تھا۔ اس کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت صدق و خلوص تھا۔ اُس نے جو سمجھا اور جو کہا اس پر عمر بھر عمل بھی کیا۔ اُس نے کسی معاملہ میں چاہے وہ مذہب و اخلاق ہو یا تمدن و معاشرت کبھی رسوم و روایات کا کورانہ اعتراف نہیں کیا سوا ادبیات اور بالخصوص شاعری کے جس میں وہ رسمی پابندیوں کو نہ صرف روا رکھتا تھا بلکہ قدم اُٹھانے کے لئے پہلی شرط بتاتا تھا اور "اگلے وقتوں کے ان لوگوں کو دل سے مانتا تھا جو "مئے و نغمہ کو اندوہ ربا" کہتے آئے ہیں۔ یہی ایک دنیا ایسی تھی جس میں رشید نے کبھی کسی قسم کی بدعت کو جائز نہیں رکھا ورنہ عام طور پر مشہور تھا کہ رسوم و قیود کے خلاف جہاد کرنا اور ان کو توڑ کر مٹا دینا رشید نے اپنی زندگی کا منصب اولیں قرار دے رکھا ہے۔ اس کے احباب اس کے مسلک کو "عدمیت" (Nihilism) کے جدید نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ مگر یہ کچھ مغربی تعلیم کا نتیجہ نہ تھا۔ رشید کی اُفتادِ طبیعت بچپن ہی سے کچھ ایسی تھی۔ وہ غالباً ان لوگوں میں سے تھا جو حرم کا طواف کرنے کے لئے بغل میں بُت لیکر نکلتے ہیں اور جب بتکدہ میں مورتوں کے سامنے آتے ہیں تو ہو الحق کے نعرے مارنے لگتے ہیں۔

دور و نزدیک رشید کا نام وحشی پڑ گیا تھا۔ بعض تو ایسے تھے جو اس کی وحشت کی معصومیت کے قایل تھے اور اس کی ہر زبردستی کو معاف کر دینے کے لئے تیار تھے لیکن زیادہ تر لوگ یا تو اس سے جلتے تھے یا مارے ڈر کے اس کے منہ آنا نہیں چاہتے تھے۔ رشید کو ان میں سے کسی کی بھی پرواہ نہ تھی۔ اس نے کیا ہمیشہ وہی جو اس کا جی چاہا۔ روپے پیسے سے وہ سب کا شریک حال رہتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے نہ وہ کسی کی خوشی کی تقریب میں شریک ہوتا تھا۔ نہ غم کی۔ خوشی منانا اور ماتم کرنا دونوں اس کے نزدیک ایک ہی عنوان کی چیزیں تھیں۔ دونوں انسان کے نفس کی فریب کاریاں تھیں۔ اور اس قابل نہ تھیں کہ کوئی صاحب فکر ان کی طرف کوئی اعتنا کرے۔ اسی لئے رشید نہ کہیں شادی بیاہ میں جاتا تھا نہ تجہیز و تکفین میں۔ اس کی اس عادت سے سب مانوس ہو گئے تھے اور اب وہ بہت کم کسی تقریب میں بلایا جاتا تھا۔

طبیعت کی یہی وارستگی اور بے تعلقی یا گھر کے بڑھوں کی زبان میں "خود سری" تھی جس نے بی۔ اے کرنے کے بعد رشید کو سرکاری ملازمت کے خیال سے باز رکھا۔ گھر کا خوش حال اور پیٹ کی فکر سے آزاد تھا۔ اور پھر اپنے بڑھے باپ کا اکلوتا تھا آن رہ گئی اور بات نبھ گئی۔ جو چاہا وہ کیا اور جو کیا اس کی لاج آخر وقت تک رکھی۔ رشید اپنی زندگی میں اب کسی چیز کی کمی نہیں پاتا تھا۔ علم اور دولت دونوں کی فراوانی تھی۔ ہر مجلس میں اور ہر موقع پر وہ اپنے کو ممتاز اور سربلند پاتا تھا۔ لیکن اس کے لئے سب سے بڑی مسرت یہ تھی کہ اب اس کی ملکہ مہ جبیں، اس کو ملنے والی تھی جس تنویر کا بت وہ بچپن سے اپنے دل کے مندر میں قایم کئے ہوئے تھا اس سے اب رشید کی شادی ہونے والی تھی۔ رشید کا اترانا بجا تھا کہ جس چیز کو اس کے دل نے چاہا آخر کار وہ اس کے لئے "پردۂ تقدیر" سے مہیا کی گئی۔

(۲)

آٹھ برس کی مدت ایک عمر ہوتی ہے۔ اس مدت کے اندر رشید میں جو حیرتناک تبدیلی ہو گئی تھی اس کی تقریب اور تاریخ سے واقف سب تھے لیکن کوئی اس کو سمجھ نہ پاتا تھا۔ اس راز کو صرف دیہات کی عورتیں جانتی تھیں اور اپنی زبان میں بیان کیا کرتی تھیں کہ محبت کافر کو دیندار اور دیندار کو کافر بنا سکتی ہے۔ چنانچہ رشید کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے موضع علی پور کے نواح میں کنوؤں پر پانی بھرنے والیوں کی زبان سے اکثر سننے میں آیا ہے کہ "دل کی لاگ جو نہ کر دکھائے تھوڑا ہے"۔

رشید نے ۲۲ سال کی عمر میں بی۔ اے پاس کیا اور اس آن بان کے ساتھ کہ دور دور اس کا نام وردِ زبان ہو گیا۔ انگریزی تعلیم سے پہلے رشید کو عربی اور فارسی کی خاطر خواہ تعلیم دلائی جا چکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رشید کی معاشرت میں مغرب کی خفیف سے خفیف جھلک بھی نہیں تھی۔ مغرب کے علم و ادب سے وہ جسقدر بھی متاثر ہوا ہو لیکن اس کی معاشرت خالص ہندوستانی تھی۔ جس سال رشید نے تحصیل علم سے فراغت پائی اسی سال وہ اپنے ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ میں تعلیمی صیغہ کا ایک زبردست رکن ہو گیا۔ ایسا رکن جس کی ہر صلاح قابل تسلیم اور ہر آواز وقیع سمجھی جانے لگی۔

سب دیکھ رہے تھے کہ لڑکا نہ صرف علم و فضیلت میں فایق ہے بلکہ جاہ و ثروت کے اعتبار سے بھی ہونہار ہے اور پھلنے پھولنے والا ہے۔ جہاں کہیں اس کا ذکر آتا ناممکن تھا کسی نہ کسی کی زبان سے یہ سننے میں نہ آتا "ہاں بھائی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اسی کو تو کہتے ہیں"۔ تنویر کے ماں باپ بھی جو رشید کے قریبی رشتہ دار تھے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے اور اب ان کو کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ اب وہ اپنی لاڈلی تنویر کو رشید کے ساتھ بیاہ دینے کے لئے تیار تھے ورنہ پہلے وہ بیٹی کے لئے لکھنؤ میں اس سے بھی اونچا گھر نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر اب لوگوں نے اس کا اعتراف کرنا شروع کیا کہ تنویر کو قدرت نے رشید ہی کے نام لکھ دیا تھا۔ غرضکہ ڈیڑھ دو سال کے اندر تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے اور ساری رسمیں ادا کی جا چکی تھیں۔ نکاح کی مبارک تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ جس تنویر نے اول اول اُلفت کی بازی رشید سے مکتب

میں جیتی تھی وہ اب ہمیشہ کے لئے رشید کی ہو جانے والی تھی۔ رشید اس خیال سے مدہوش ہو رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں رشید نے کسی رسم کی خفیف سے خفیف مخالفت بھی نہیں کی۔ جتنے ارمان کہ تنویر کے ماں باپ یا خود اسکے ماں باپ اس موقع پر نکالنا چاہتے تھے رشید نے ایک ہلکی سی چیں جبیں کے ساتھ سب کو گوارا کر لیا۔ اب اس کو کمزوری کہئے یا جذبۂ محبت کی انتہائی قوت، بات ایک ہی ہے اور رشید پر اس کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

شادی کو ایک ہفتہ سے کچھ زیادہ دن ہو گئے تھے۔ رشید کی "شب امید" "روز عید" سے بہتر گزر رہی تھی اور وہ ایک ملنے والی فردوس کے خیال میں دنیا کی ہر کثافت کو بھولا ہوا تھا۔ زندگی اس کے لئے یکسر نشاط و بالیدگی ہو رہی تھی وہ آج کل ہر کام میں ایک تازہ حوصلہ اور ایک غیر معمولی انبساط محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کہ تنویر کا روح افزا خیال اس کے ہر کام میں کارفرما تھا۔ لیکن وقت کو پلٹتے بھی دیر نہیں لگتی۔ ایک شام کو یکایک تنویر کو تپ چڑھی۔ اور ہفتہ بھر نہیں اتری۔ شادی کی تاریخ ایک مہینے کے لئے ٹل گئی۔ تنویر کی تپ ایک مہینہ کے بعد بھی نہیں اتری اور اب شادی ایک غیر متعین زمانہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ ایک سال ہو گیا اور تنویر کے مرض میں کوئی افاقہ نظر نہیں آیا۔ بخار اور ہاضمہ کی خرابی جس سے مرض کی ابتدا ہوئی تھی اسی طرح قایم رہ گیا۔ کسی طبیب سے مرض کی صحیح تشخیص بھی نہ ہو سکی۔ آخر کار اسی میں تنویر کا کام تمام ہو گیا اور شادی کی گھڑی نہ آنا تھی نہ آئی۔ رشید کی دنیا خراب ہو گئی۔

(۳)

رشید کی عمر تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اب اس کا یہ حال تھا کہ وہ زندگی سے کہیں زیادہ موت کو بامعنے پاتا تھا۔ وہ اب ادبیات کی طرح موت کے رسوم و روایات کو بھی اہم سمجھنے لگا تھا۔ عیدین کی نماز پڑھے یا نہ پڑھے لیکن جنازہ کی نماز میں شریک ہونا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اب قبروں کی داشت پرداخت اور ان پر روز شام کو فاتحہ پڑھنا رشید کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا اس کے خیال میں موت زندگی کی تخریب نہیں تھی بلکہ عین تکمیل تھی۔ اور مُردوں کی دنیا اس جیتی جاگتی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع اور پائدار تھی، رشید کے خیال میں خلود و ابدیت کا دوسرا نام موت تھا۔

رشید میں یہ تبدیلیاں تنویر کی موت کے بعد پیدا ہوئیں اور روز بروز جڑ پکڑتی گئیں۔ موت کا اب وہ اسی قدر دیوانہ تھا جسقدر کبھی تنویر کا تھا۔ اور مزاروں سے اس کو وہ اُلفت پیدا ہو گئی تھی جو کسی کو صرف اپنی زاد بوم سے ہو سکتی ہے۔ علی پور کا قبرستان جو کبھی ایسا سنسان اور بھیانک تھا کہ لوگ دن دوپہر ادھر سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے اب ایک وسیع چمن زار نظر آتا تھا اور یہ سب رشید کا کیا ہوا تھا۔ تنویر کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی تمام زندگی اور دولت اس قبرستان پر صرف کر دے گا۔ اُس نے قبرستان کے چاروں طرف ایک پختہ چار دیواری بنوائی اور اس کے اندر سلیقہ اور ذوق کے ساتھ پھولوں کے تختے اور کنارے کنارے سایہ دار درختوں کی قطاریں لگائیں۔ قبروں کی مرمت ہوئی

اور ایک قبر کو بھی شکستہ حالت میں نہ رہنے دیا گیا۔

زندگی کے دستور کے مطابق قبرستان کی آبادی برابر بڑھتی جاتی تھی۔ اور اسی نسبت سے اس کی وقعت بھی بڑھتی تھی۔ رشید کا حکم تھا کہ جو نئی قبر بنے اس پر اس کے نرخ سے سبزہ اور پھلواری کا اہتمام کیا جائے اور روز شام کو اس پر شمع جلائی جائے۔ رات کو قبرستان میں چراغاں کا عالم رہتا تھا جو سیر کے قابل ہوتا تھا۔ رشید کی طرف سے ایک حافظ اور چار مالی مقرر تھے۔ سارے قبرستان کا انتظام انھیں کے سپرد تھا۔ روز شام سے آدھی رات تک خود رشید قبرستان میں رہتا تھا اور زندگی کو موت کی روشنی میں دیکھا کرتا تھا۔ تنویر کی خوابگاہ کے سرہانے بیٹھا ہوا وہ یا تو کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا یا اپنے مُردوں کو گنا کرتا تھا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ مرنے کے بعد ہر شخص اس کا اپنا ہو جاتا ہے اور یہ سبھی قبریں اسی کی ملکیت ہیں۔ قبرستان میں پختہ قبروں کی تعداد بھی کافی تھی اسلئے کہ نادار وارثوں کی درخواست پر رشید اکثر قبروں کو پختہ کرا دیتا تھا۔ سارے قبرستان کی جان تنویر کی قبر تھی جو ہر وقت دُلہن کی طرح بنائی سنواری رہتی تھی اور رشید اس کو اپنی دولھن سمجھتا تھا۔

(۴)

رشید نے تنویر کی تجہیز و تکفین میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اب وہ تنویر کی برسی ہر سال بڑی دھوم سے منایا کرتا تھا۔ اور تاریخ سے پہلے ہفتوں تک اس جوش اور ولولہ کے ساتھ اہتمام رہتا تھا گویا گھر میں کوئی شادی رچائی جا رہی ہے اور ایک ہفتہ پہلے تو وہ ایسا منہمک رہتا تھا کہ قبرستان کا جانا بھی ملتوی رکھتا تھا۔

سارا سال رشید اسی تاریخ کے انتظار میں اس طرح گزارتا تھا جس طرح بچے عید کے انتظار میں اور اس تاریخ کی صبح کو وہ ایسی امنگوں اور امیدوں کے ساتھ اٹھتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کوئی نوشہ ہے جس کی شام کو بارات جانے والی ہے۔ اس دن تنویر کی تربت غیر معمولی طور پر سجائی جاتی تھی۔ دن بھر خیراتیں بٹتی تھیں۔ کھانے کھلائے جاتے تھے اور آنے جانے والوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ شام کو فراغت پا کر اتنے دنوں بعد رشید قبرستان جاتا تھا تو ایسا محسوس کرتا تھا کہ اپنی دُلہن کے حجلہ میں داخل ہو رہا ہے۔

آج تنویر کی نویں برسی تھی۔ تمام رسوم و فرایض ادا ہو چکے تو شام کو رشید قبرستان گیا اور تنویر کی قبر کے پاس بیٹھ کر جوان میر شاعر کیٹس کے ان الفاظ پر غور کرنے لگا:۔

"شعر۔ شہرت اور حسن بیشک بڑی عمیق چیزیں ہیں لیکن موت ان سب سے زیادہ عمیق ہے۔ موت زندگی کا انتہائی اکتساب ہے۔"

اس طرح مشکل سے چند منٹ گزرے تھے کہ اس کے کان میں کسی کے رونے کی دھیمی دھیمی آواز آنے لگی، جو قبرستان کے اندر ہی معلوم ہوتی تھی اور اس سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہ تھی۔ رشید نے اس سمت نظر اٹھائی تو شام کے پُراسرار دھندلکے میں صرف اتنا پتہ چل سکا کہ ایک قبر سے لپٹا ہوا کوئی رو رہا ہے۔ رشید کو اپنے مُردوں کا

صحیح علم تھا۔ اس کو غوراً احساس ہوگیا کہ یہ تازہ قبر ہے جو اس ایک ہفتہ کے اندر بنی ہے۔ اُس نے چاہا کہ چل کر اس نئی قبر کو دیکھے اور اس نئے عزادار کا حال دریافت کرے لیکن پھر اس خیال سے رُک گیا کہ یہ دوسروں کے کام میں مداخلت ہوگی اس لئے وہ اُٹھکر حافظ کے پاس آیا جو قبرستان کے پھاٹک کے قریب حجرہ میں بیٹھا قرآن پڑھ رہا تھا۔ رشید نے اس سے پوچھا:۔

"یہ آج قبرستان میں بلک بلک کر کون رو رہا ہے؟ اور یہ نئی قبر کس کی ہے؟"

"حضور یہ منظور میاں کی قبر ہے" حافظ نے جواب دیا "اور یہ وہی لڑکی ہے جس کو سال بھر ہوا وہ نکال لائے تھے اور کچھ دنوں بعد شادی کر لی تھی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ کچھ عرصہ سے منظور میاں کی پیٹھ میں پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ دس دن ہوئے اس کا آپریشن ہوا تھا مگر مرض بڑھتا گیا اور ان کے سارے بدن میں زہر پھیل گیا۔ آج تین دن ہوئے ان کا انتقال ہوگیا اور انکے گھر والوں نے اس بدنصیب لڑکی کو ہاتھ پکڑ کر نکال دیا۔ آج تین دن سے بیچاری اسی طرح قبر سے لپٹ کر رو رہی ہے۔ سُنا ہے اسی علی پور میں میر جُلاہے نے ترس کھا کر اس کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔"

حافظ سے یہ روداد سُنکر رشید کچھ دیر کے لئے سکتہ میں آگیا۔ منظور اس کا بچپن کا ساتھی تھا اور اس کی اپنی برادری کا تھا۔ وہ بھی گھر کا خوشحال تھا لیکن اتنا نہیں کہ رشید کی طرح جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا۔ اس کے علاوہ منظور کی طبیعت بھی رشید سے مختلف تھی۔ وہ پکا دنیادار اور ابن الوقت تھا۔ اسی نے بالآخر رشید اور اس کے درمیان کدورت پیدا کردی۔ رشید فارغ التحصیل ہوکر گھر آیا تو چند دنوں میں تجارتی کاروبار شروع کر دیا اور اس میں بڑی اُمنگ اور فراخدلی کے ساتھ منظور کو بھی شریک رکھا۔ منظور نے اس میں ایسی خودغرضی اور بے ایمانی دکھائی کہ رشید کا دل اس سے پھر گیا اور وہ بہت جلد منظور سے الگ ہوگیا۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔

منظور کی بیوی کو مرے ہوئے عرصہ ہوا تھا اور اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ لیکن سال بھر ہوا تھا کہ وہ قصبہ منگروٹی سے جو علی پور سے تین کوس کے فاصلہ پر تھا ایک جولاہے کی لڑکی کو نکال لایا تھا۔ لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ اور اس کی صورت کا شہرہ دور دور تھا۔ منظور نے ایک مرتبہ اس کو دیکھا اور ہمیشہ کے لئے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ سکینہ پر بھی منظور کی صورت کا اثر ہوگیا اور وہ اس کے ساتھ بھاگ نکلنے پر آمادہ ہوگئی۔

رشید کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن وہ خود اپنی دنیا میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ کسی اور بات کا اس کو ہوش ہی نہیں تھا آج اُس نے سنا کہ منظور مرگیا تو اس کے دل کی عجیب حالت ہوئی لاکھ بُرا آدمی سہی پھر بھی منظور کے ساتھ اس کے بچپن کی سیکڑوں یادیں وابستہ تھیں، افسوس کہ مرنے سے پہلے اس نے منظور سے آخری ملاقات نہیں کی مگر اس کو کیا معلوم تھا؟ دوسرا خیال سکینہ کی بیکسی اور بیچارگی کا تھا۔ جو اسوقت رشید کو بری طرح بیچین کر رہا تھا۔ بیچاری کی زندگی کا اب کیا سہارا ہوگا؟ کون اس کی دستگیری کرے گا؟ رشید کچھ دیر ان خیالات میں گم رہا اور پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ رہا۔

سکینہ پورے دو گھنٹے رو کر اٹھی اور جانے لگی۔ رشید نے پیچھے سے اس کو دیکھا۔ اُس نے اس کی چال میں ایک عجیب گداز اور سوگوارانہ انداز پایا جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

آدھی رات کے قریب رشید گھر آیا تو منظور اور سکینہ کی واردات پر بڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ رشید اور سکینہ دونوں کے مقدر کسقدر یکساں تھے۔ رشید کو سکینہ اپنی شریک تقدیر نظر آنے لگی۔ اور یہ شرکت کچھ ازلی سی معلوم ہو رہی تھی۔

(۵)

دوسرے روز شام کو رشید قبرستان پہونچا تو پھر وہی بلکنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ سکینہ اس سے پہلے آچکی تھی۔ رشید تھوڑی دیر تک تو اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آئی کہ وہاں سے اُٹھا اور یہ سننے کی غرض سے کہ سکینہ کیا بین کر رہی ہے چکر لگا کر پیچھے سے سکینہ کے قریب آیا۔ معلوم نہیں سکینہ کو اس کی آہٹ ملی یا نہیں لیکن اُسنے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہ کی۔ رشید آہستہ سے چند گز کے فاصلہ پر بیٹھکر سننے لگا۔ سکینہ کہہ رہی تھی "تم مجھ کو کس پر چھوڑ گئے؟ اب دُنیا میں میرا کون ہے؟۔ ہائے اب میں اس قابل بھی نہیں کہ جی کھول کر تمھارا تیجا چالیسواں کر سکوں۔ آج تمھارے گھر والے اپنا ہر ارمان پورا کر کے اپنا غم غلط کر رہے ہیں۔ لیکن میں سوا ان پھولوں کے تمھارے نام پر کچھ نہیں دے سکتی۔ آہ! تم نے میرے لئے کبھی ساری دنیا سے لڑائی مول لی تھی اور آج میرے حال سے ایسا بے خبر ہو!"۔ یہ کہکر سکینہ سسکیاں لینے لگی۔ معلوم ہوتا تھا اس کا کلیجہ منہ کو چلا آرہا ہے۔ رشید کا دل بھر آیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا اور سکینہ کے سامنے آکر نہایت نرمی کے ساتھ کہنے لگا "تم کو کس چیز کی ضرورت ہے؟۔ تم اپنے مُردہ کے ساتھ کیا کیا ارمان نکالنا چاہتی ہو؟۔ تم جو کہو تمھارے لئے مہیا کر دیا جائے۔ تم جانتی ہو میں یہی کیا کرتا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اس قبر کو پختہ بھی بنوا سکتی ہو۔۔۔۔"

رشید اس سے زیادہ کہنے نہیں پایا۔ سکینہ نے اپنی آواز سنبھال کر بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے کہا "آپ یہ کیسے کریں گے اور کیوں؟۔ آپ نے تو ان کو معاف بھی نہیں کیا۔ آپ کا یہی احسان کیا کم ہے کہ اور قبروں کی طرح اس پر بھی چراغ جل رہا ہے!۔۔۔۔" یہ کہکر سکینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چپ ہو گئی۔ رشید نے بھی ایک گہری سانس لی اور کہا "مجھے اگر معلوم ہوتا کہ منظور مر رہے ہیں تو میں آکر اپنے کو ان سے معاف کراتا اور خود ان کو معاف کرتا لیکن میں تو نہ جانے کس دنیا میں رہتا ہوں کہ کسی بات کا علم نہیں ہونے پاتا۔ مگر میں نے اب منظور کو معاف کر دیا۔ ان کی روح بھی مجھے معاف کرے۔ اب تو تم کو کوئی عار نہ ہونا چاہئے۔ بولو تم کو کن چیزوں کی ضرورت ہے اور تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

سکینہ اس کے جواب میں "کچھ نہیں" کہکر وہاں سے چلنے لگی۔ اس کے دو ڈھائی گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ چاند نکل رہا تھا اور ہلکی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سکینہ رشید کے سامنے اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو چاند کی صبیح روشنی میں رشید نے اس کو اچھی طرح دیکھا اور اس کو قائل ہونا پڑا کہ اگر اس صورت نے منظور کو ایسا خود فراموش کر دیا تھا تو حیرت کی کوئی بات نہ تھی

سکینہ تو ایک کافوری مورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کی دیوی نے اپنی پرچھائیں زمین پر ڈال کر اس کو مجسم اور جاندار بنا دیا ہو سکینہ کی آنکھوں میں ایک پراسرار گہرائی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک معصومانہ مستی ٹپک رہی تھی۔ اس کی کشادہ صندلی پیشانی دیکھنے والے کے دل میں ایک ذوق عبودیت پیدا کرتی تھی۔ رشید کو ان باتوں کا شدید احساس ہونے لگا اور وہ کچھ دم بخود سا رہ گیا۔ سکینہ چلی گئی اور وہ پھر اصرار نہ کر سکا کہ وہ اس کی مدد قبول کرلے۔

دوسرے دن سکینہ کے پاس اُس نے پچاس روپے بھجوا دئے تو سکینہ نے اس کو واپس کر دیا۔ رشید کو اس کا صدمہ ہوا اور وہ دن بھر افسردہ رہا۔ شام کو قبرستان میں سکینہ سے ملاقات ہوئی تو رشید نے کہا "تم نے روپے واپس کر کے مجھے بڑا صدمہ پہونچایا ہے۔۔۔۔" وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ سکینہ نے جواب دیا "جب وہی نہیں رہا جو میرا اصلی سہارا اور میری زندگی کا بھروسا تھا تو اور کوئی میری کیا مدد کرے گا اور کب تک؟۔ آپ اس کا رنج نہ کیجئے۔ آپ نے میری مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی لیکن اس کو قبول کرنے کے لئے میرا دل نہیں اُبھرتا۔" رشید کی طبیعت اُلٹنے لگی اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "سکینہ تمھاری حالت پر میرا دل دکھتا ہے اور میرا بال بال تم پر روتا ہے۔ اگر ایک بدنصیب کو دوسرے بدنصیب کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی تو کوئی دُنیا سے نرالی بات نہیں ہوئی۔ مجھے اپنا شریک حال سمجھو۔ للہ میری خواہش کو یوں نہ ٹھکراؤ۔ میں عمر بھر اسی طرح تمھاری مدد کرنے کے لئے طیار رہوں۔" یہ کہکر اُس نے جیب سے سکینہ کے واپس کئے ہوئے روپے نکالے اور اس کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ سے بڑھا کر کہا "لے لو، خدا کے لئے لے لو اور جسقدر ضرورت ہو مجھ سے کہو۔" رشید کی آواز کانپ رہی تھی اور سکینہ نے اس میں دردمندی محسوس کی۔ اُس سے کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ اُس نے روپے لے لئے اور زار زار رونے لگی۔ رشید اس کی طرف سے مُنھ پھیرے ہوئے تھا اور اسکی آنکھوں میں بھی آنسو جھلک رہے تھے۔

رات کو جب رشید گھر واپس آیا تو پلنگ پر لیٹ کر بڑی دیر تک اپنے اور سکینہ کے مقدر پر غور کرتا رہا۔ یہ اتفاق رہ رہ کر اُس کے دل میں ایک خلش سی پیدا کر رہا تھا۔

(۶)

سکینہ رشید کے لئے ایک نیا انکشاف تھی۔ جوں جوں وہ غور کرتا تھا سکینہ اس کو اپنے ہی مقدر کا دوسرا رخ معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کو سکینہ کے ساتھ ایک نہایت لطیف اور بلیغ قسم کا تعلق خاطر پیدا ہو چلا ہے جسکی طرف سے تجاہل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سکینہ سے روز شام کو قبرستان میں ملتا تھا۔ شروع شروع یہ ملاقات مختصر اور رسمی حد تک رہی رہی۔ لیکن اب یہ دونوں ہم طالع ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ اب سکینہ کو بھی رشید کی صحبت میں سکون ملنے لگا تھا اور وہ اکثر آدھی رات تک قبرستان میں ٹھہری رشید سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کا غم غلط ہو چلا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ خبر آس پاس مشہور ہونے لگی کہ رشید اور سکینہ روز آدھی رات تک قبرستان میں رہتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہے پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن دور دور رشید کا رعب ایسا جما ہوا تھا کہ کوئی کچھ زبان پر نہ لاتا تھا۔ سکینہ جانتی تھی کہ ہر طرف کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ اور وہ افسردہ اور فکرمند رہنے لگی تھی۔

ایک دن رشید قبرستان پہونچا تو سکینہ خلاف دستور وہاں موجود نہیں تھی۔ رشید نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سکینہ کچھ عرصہ سے سرِ شام قبرستان پہونچ جاتی تھی اور رشید کا انتظار کرتی تھی۔ آج رشید رہ رہ کر ہر طرف دیکھتا تھا مگر سکینہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ رشید کو حیرت بھی تھی اور تشویش بھی۔ اس طرح کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ سکینہ پھاٹک سے داخل ہوتی دکھائی دی۔ رشید نے اطمینان کی سانس لی۔

سکینہ آج معمول سے زیادہ فکرمند اور پریشان نظر آرہی تھی اور رُک رُک کر باتیں کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ رشید نے فوراً اس کو محسوس کر لیا۔ اور پوچھا۔ "سکینہ آج تم کچھ زیادہ پریشان معلوم ہو رہی ہو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ یا کسی سے کوئی ناگوار بات تو نہیں ہوئی ہے؟"۔ سکینہ نے کہا "نہیں کچھ نہیں" اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہا۔ لیکن رشید کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔

دونوں تنویر کے مزار کے پاس بیٹھے تھے۔ گرمی کے ابتدائی دن تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے جو جسم میں ایک پرکیف خنکی پیدا کر رہے تھے۔ تنویر کی قبر کی شمع جھلملا رہی تھی۔ سکینہ کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خاموش تھی۔ رشید اصرار کر رہا تھا "نہیں تم مجھ سے چھپاتی ہو۔ کوئی بات ضرور ہے۔ تم کو معلوم نہیں کہ اس سے مجھ کو کتنا رنج ہوتا ہے"۔ سکینہ نے آخر کار رُکتے رُکتے کہا۔ "آپ کا مجھ سے اس طرح ملنا معیوب سمجھا جا رہا ہے اور سچ پوچھئے تو معیوب ہے بھی"۔

"کیوں؟" رشید نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

سکینہ نے جواب دیا "اس لئے کہ آپ مرد ہیں میں عورت اور پھر اس لئے کہ آپ ہر بات میں مجھ سے اُونچے ہیں آپ امیرزادے ہیں۔ ہر طرح کا سکھ خدا نے آپ کو دیا ہے اور میں ایک دکھیا بھکارن ہوں۔ میرا آپ کا کیا میل؟ — جن لوگوں نے مجھے پناہ دے رکھی ہے آج وہ بھی بڑی بھائی کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ اگر میں نے آپ سے یہ بے تکلفی نہ چھوڑی تو وہ مجھ کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنے گھر کو بدنام نہیں کر سکتے۔ اب میں اپنی قسمت پر چار آنسو بہانے بھی یہاں نہیں آسکتی"۔ سکینہ کی زبان رُک گئی اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پھر وہ جی کھول کر روئی اور دیر تک اس کے آنسو نہ تھمے۔

رشید کے دل میں یکایک بغاوت کا ایک طوفان اُٹھا جس نے اس کے اندر ایک مجذوبانہ توانائی پیدا کر دی۔ وہ اپنی جگہ سے بے اختیار اُٹھا اور سکینہ سے جا کر لپٹ گیا۔ سکینہ نے اس سے اپنے کو چھڑانا چاہا لیکن رشید کی آغوش اتنی ڈھیلی نہ تھی۔ رشید نے اپنی آغوش کو اور تنگ کر کے اور سکینہ کی پیشانی کو چوم کر کہا "یہ اس کا ثبوت ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کو میرا عہد سمجھو۔ میں زندگی بھر تمہاری مدد کروں گا اور تم کو اپنی پناہ میں رکھوں گا۔

سکینہ خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کرو۔ میں اگر تم کو اپنی پناہ میں رکھوں گا تو میرے دل کو بھی تسکین رہیگی اور میں ایسا محسوس کروں گا کہ خود بھی کسی کی پناہ میں ہوں۔" رشید کا دل دھڑک رہا تھا۔ سکینہ نے پھر اس کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور تنویر کی قبر کا چراغ گل ہوگیا۔ رشید کا دل دھک سے ہوکر رہ گیا اور اس کی آغوش خود بخود ڈھیلی ہوگئی۔ سکینہ اُٹھی اور جانے لگی۔ رشید نے ہیجانی آواز میں پوچھا "کہاں جارہی ہو؟" سکینہ نے کہا "حافظ جی کے پاس دیا سلائی لینے۔ دیکھئے قبر کا چراغ ہوا سے بجھ گیا۔" سکینہ حافظ کے حجرہ سے دیا سلائی لے آئی اور بجھے ہوئے چراغ کو جلا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کہیں اور کوئی چراغ تو نہیں بجھا ہے۔ مگر باقی چراغ جھلملا رہے تھے۔۔۔۔۔۔

اس دن رشید گھر آیا تو ساری رات سوچتا رہا۔ ہیئت اجتماعی سے جو فطری بغاوت اس کے خمیر میں تھی اور جس کو کچھ عرصہ سے وہ بھولا ہوا تھا وہ آج ایک نئی قوت کے ساتھ اُبھر آئی تھی اور اس کو بیچین کر رہی تھی۔ آخر انسان اپنی فطرتِ اصلی کو کب تک بھولا رہے گا؟ یہ سماجی امتیاز و تصادم ہم کو کہاں لیجائیگا اور ہمارا کیا حشر ہوگا؟ حیات انسانی کی بنیاد ریا اور رسم پرستی پر کب تک قایم رہے گی؟ تمدن کی ابلیسیت انسان کو کب تک بدراہ رکھے گی؟۔ یہ تھے وہ سوالات جنھوں نے ساری رات رشید کو پیچ و تاب میں رکھا۔ سکینہ اگر رشید کی ہم پلہ ہوتی تو شاید آج قبرستان کی ان ملاقاتوں میں اتنی قباحتیں نہ ہوتیں۔ اور رشید جو راستہ مناسب سمجھتا اختیار کرتا۔ اسوقت کسی کو شاید کسی قسم کی مزاحمت کا خیال بھی نہ آتا۔ لیکن سماج کو مداخلت کا سب سے بڑا حق اس لئے حاصل ہے کہ رشید ایک صاحب حیثیت ہے اور ایک عالی خاندان زمیندار ہے اور سکینہ نیچی ذات سے تعلق رکھتی ہے اور محتاج و ناچار ہے۔ اس خیال سے رشید کو تپ سی چڑھ رہی تھی۔

(۷)

پندرہ بیس روز سے رشید اور سکینہ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سکینہ نے اسی دن سے قبرستان آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک طرف تو رشید دنیا اور اس کے رسم و رواج کو کوس رہا تھا جس نے دو دردمند دلوں کو یکجا نہ رہنے دیا دوسری طرف دل ہی دل میں وہ اس خیال سے پشیمان تھا کہ اگر اس دن وہ سکینہ کے سامنے اپنے جذبات سے اس طرح بے قابو نہ ہوجاتا اور اس نے ایسی بے ساختگی نہ برتی ہوتی تو سکینہ قبرستان آنا نہ چھوڑتی۔ آخر سکینہ نے اس کو کیا سمجھا ہوگا؟ اس خیال سے رشید مضمحل ہو رہا تھا۔

رشید قبرستان برابر جاتا تھا لیکن اب اس کو فضا میں ایک کمی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ سکینہ کی کمی تھی۔ سکینہ کا خیال لمحہ کے لئے بھی اس کے دل سے دور نہیں ہوتا تھا۔ وہ جتنا ہی زیادہ سوچتا تھا اتنا ہی زیادہ سکینہ کے مقدر کو اپنے مقدر سے ہم آہنگ پاتا تھا۔ سکینہ اس کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہوگئی تھی۔ بعض اوقات انتہائی غم و غصہ میں رشید

یہ سوچتا تھا کہ جس بیدرد دنیا نے سکینہ سے قبرستان چھڑایا ہے اس کے سامنے ابھی جاکر ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دے کہ اس نے سکینہ کو رسم و قانون کی تمام پابندیوں کے ساتھ اپنی پناہ میں لے لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دنیا کی سفاکانہ رسم پرستی کا جواب ایسی ہی سرتابی سے دیا جا سکتا ہے۔ اگر دو قسمت زدہ ایک دوسرے کی رفاقت اور ہمدردی کرتے ہیں تو اس میں دوسروں کا کیا بگڑتا ہے جو خواہ مخواہ محاسبہ پر طیار ہو جاتے ہیں؟

لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ رشید خود بھی اس خاص معاملہ میں ایسی علانیہ بغاوت کی تاب اپنے اندر کم پاتا تھا اور اس کا سارا جوش تھوڑی ہی دیر میں دب جاتا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یقیناً یہ تھا کہ اس کو سکینہ کے دل کا حال معلوم نہیں تھا۔ نہ جانے وہ اس کے جذبات کی پذیرائی کرے گی یا نہیں؟ اس کی باتوں سے پایا جاتا تھا کہ وہ بھی دنیا کے رسم و رواج کی دل سے قایل ہے اور دنیا کی رائے کو اہم اور وقیع سمجھتی ہے۔ پھر تالی ایک ہاتھ سے تو بجتی نہیں۔ اگر سکینہ نے اس کی بات نہ مانی اور اس کا ساتھ نہ دیا تو پھر وہ کیا کرے گا؟۔ اسی لئے رشید سکینہ سے مل کر کم سے کم ایک آخری بار باتیں کر کے اپنے کو مطمئن کر لینا چاہتا تھا مگر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ سکینہ کو کسی سے بلوا بھیجے اور بظاہر سکینہ کے قبرستان میں آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اسی انتشار اور تذبذب میں ہفتوں گزر گئے۔

عرصہ سے قرب و جوار میں شدید طاعون پھیلا ہوا تھا۔ بڈھوں کا کہنا تھا کہ ایسی زہریلی وبا ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ جو ایک مرتبہ مبتلا ہوتا تھا پھر کسی طرح جانبر نہ ہو سکتا تھا۔ رشید آج کل زندگی سے بری طرح بیزار ہو رہا تھا۔ بارہا اس کے دل میں خیال گزرا کہ سب کو طاعون ہوتا ہے آخر اس کو کیوں نہیں ہوتا کہ ایک ہی بار زندگی کی ساری آزمائشیں ختم ہو جائیں۔

ایک دن صبح کو رشید اٹھا تو اس کے سر میں درد تھا اور ماتھا جل رہا تھا۔ بخار کی علامتیں ظاہر تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ گلے میں گلٹی بھی ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے بخار ایسا تیز ہوا کہ رشید پر غفلت طاری ہو گئی۔ ہر طرف خبر مشہور ہو گئی کہ رشید کو طاعون ہو گیا اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ سکینہ نے سنا تو اس پر بجلی سی گری اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بھی خاک سیاہ ہو گیا۔ وہ اپنے کو رشید کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ اگر اس کو معلوم ہو جاتا کہ رشید صرف چند دنوں کیلئے اور اس دنیا میں مہمان ہے تو وہ قبرستان کا جانا نہ چھوڑتی۔ مگر وہ کیا جانتی تھی۔

لیکن جو بچنے والا ہوتا ہے وہ موت سے بھی بچ جاتا ہے۔ ایک ہفتہ تک جینے مرنے کی کشمکش میں مبتلا رہ کر رشید سنبھلنے لگا۔ موت کی گھڑی ٹل چکی تھی اور اس میں زندگی اور صحت کے آثار پائے جانے لگے تھے۔ ہوش آتے ہی رشید نے ملازم سے پوچھا کہ سکینہ کا کچھ حال معلوم ہے۔ ملازم نے جواب دیا "سرکار وہ روز آپ کو پوچھنے آتی تھی اور گاؤں والوں سے گھڑی گھڑی آپ کی حالت دریافت کرتی تھی"۔

(۸)

رشید بالکل اچھا ہو چکا تھا۔ صرف نقاہت باقی تھی جو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ کے ساتھ اس کو جو ٹکاؤ پیدا ہو گیا

تھا وہ اس بیماری کے بعد اچھی طرح واضح اور متعین معلوم ہو رہا تھا۔ اور اب رشید اپنے اندر ایک نئی قوت اور ایک زبردست جرأت پا رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ موت کے منہ میں جا کر وہ صرف اس لئے نکلا ہے کہ اپنی زندگی کا کوئی نیا دستور بنائے۔ وہ دستور کیا ہو؟۔ رشید کئی دن تک سوچتا رہا۔ وہ رہ رہ کر ایک ہی فیصلہ پر پہونچتا تھا۔۔

ایک رات کو اُس نے تنویر کو خواب میں دیکھا۔ تنویر کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی جس سے بصیرت اور دانائی ٹپک رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "رشید کس کشاکش میں پڑے ہوئے ہو؟ آخر جب تک زندہ ہو زندہ رہنا ہے۔ پھر خواہ مخواہ اپنی اُبھرتی ہوئی طبیعت کو کیوں مارتے ہو؟ دل کی آواز کو دبانا ٹھیک نہیں۔ جس کام کو انسان نیک سمجھتا ہو اس میں پس و پیش کیسا؟ میرے مزار کی ابھی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔"

رشید کی آنکھ کھل گئی۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے تنویر کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے اس کے تمام مغالطے دور کر دئے وہ اب ہر رکاوٹ اور ہر تذبذب پر قابو پا گیا۔ جو فیصلہ وہ اتنے دنوں سے کرنا چاہتا تھا وہ آج بات کی بات میں ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ اٹل تھا۔ رشید نے ملازم کو بلایا اور کہا "دیکھو جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ آج ہی شام کو آ کر مجھ سے قبرستان میں مل جائے مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے" ملازم نے کہا "مگر حضور ابھی اس قابل نہیں ہیں ۔۔۔۔" اُس نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ رشید نے سخت لہجہ میں کہا "بس جو کہتا ہوں جا کر کرو"

شام ہوتے ہوتے رشید قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے دل کی حرکت بے انتہا تیز تھی اور اس کا سارا جسم سنسنا رہا تھا۔ وہ ابھی بہت کمزور تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے گرتا سنبھلتا قبرستان پہونچا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بالکل نئی جگہ آ گیا ہے۔ ہر چیز میں وہ ایک غیر واضح اجنبیت کی جھلک پا رہا تھا۔

سکینہ تنویر کی قبر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ رشید کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھی۔ رشید کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ سکینہ نے کہا "آپ ابھی اس قابل نہیں تھے کہ یہاں تک آتے۔ مجھے گھر ہی پر بلا بھیجا ہوتا۔ مگر میں آپ کا حکم ٹالنا نہیں چاہتی تھی۔ اللہ آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔ کہہ نہیں سکتی آپ کی بیماری سے کیسے کیسے خیال دل میں آتے تھے۔ ہر وقت رلائی چلی آتی تھی"۔ "لیکن تم نے تو مجھے پہلے ہی سے چھوڑ دیا تھا" رشید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا جو بہت دور کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"اسی کا تو ملال تھا۔ مگر بابو جی تم خود سمجھو۔ دنیا کیا کہہ رہی تھی؟" سکینہ نے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔

رشید کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا دم گھٹ جائے گا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالا اور سکینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا "ہاں سکینہ آج میں اسی کی بابت فیصلہ کر کے آیا ہوں۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ دنیا کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دوں تاکہ پھر کسی کو کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہ رہے" رشید اتنا کہہ کر دم لینے کے لئے رُک گیا۔ سکینہ اس کا منہ تک رہی تھی۔ رشید نے پھر کہنا شروع کیا۔ "سکینہ مجھے تم سے

بڑا گہرا اُنس پیدا ہو گیا ہے جس کو شاید تم نہ سمجھ سکو۔ آج میں ہمیشہ کے لئے تم کو اپنی پناہ میں لینے اور اپنے کو تمہاری پناہ میں دینے آیا ہوں۔ اور چھپے چوری نہیں۔ بلکہ کھلے خزانے اگر تم کو کوئی عار نہ ہو تو میں ابھی اعلان کر دوں کہ میں کل سکینہ کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔ ہم دونوں کی زندگی ایک دوسرے سے اسقدر ملتی جلتی ہے کہ تم کو میری اس خواہش پر حیرت نہ ہونا چاہئے۔ تو بولو تیار ہو؟"

"بابو جی میں یوں تو تمہاری لونڈی ہوں۔ مگر دُنیا کیا کہیگی؟" سکینہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"دُنیا کو خدا کے لئے چھوڑو۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟۔ ہاں یا نہیں جو کچھ کہنا ہو اپنی زبان سے کہو اور جلد کہو۔ مجھ میں زیادہ بات کرنے کی سکت نہیں ہے۔" رشید کا دم پھول رہا تھا۔ سکینہ گھبرا گئی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ "بابو جی میں تمہاری ہوں۔ تم جو چاہو کرو۔ مجھے سب منظور ہے۔"

رشید یہ کہہ کر سکینہ سے لپٹ گیا "خدا تم کو جیتا رکھے۔" اور اس کے ہونٹ سے ہونٹ ملا دئے۔ سکینہ نے بھی رشید کا منہ چوم لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے محسوس کیا کہ رشید کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑکا اور پھر اس کی کوئی آہٹ نہ ملی۔ وہ سکینہ کی گود میں بے حس و حرکت سا ہو گیا۔ سکینہ نے سمجھا کہ مارے ضعف کے غش آ گیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بھی جب رشید نے کوئی جنبش نہیں کی تو سکینہ گھبرائی۔ اُس نے رشید کو اپنے سے الگ کر کے دیکھا تو وہ سانس نہیں لے رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر موت کا رنگ پھرا ہوا تھا۔ سکینہ نے بار بار رشید کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ شانہ ہلایا۔ منہ چوما۔ پکارا۔ مگر سب بے سود۔ رشید پھر ہوش میں نہ آیا۔

مجنوں گورکھپوری

۱۹۳۷ء کی بہترین تصنیف؟

ہفتہ وار اخبار گلفروش کا شاندار سالنامہ ہوگی جو ۲۰۰ سے زیادہ صفحات اور متعدد رنگین و سادہ تصاویر پر مشتمل ہوگی۔ اُردو کے چوٹی کے مضمون نگاروں اور شاعروں کے مضامین و نظم کا بہترین مجموعہ سالنامہ گلفروش کے نام سے ۲۵ اگست ۱۹۳۷ء کو شایع ہوگا۔ ہفتہ وار اخبار گلفروش کا سالانہ چندہ صرف تین روپئے آٹھ آنے ہے مگر ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء سے قبل خریداری قبول کرنے والوں کے نام صرف دو روپئے بارہ آنہ سالانہ میں جاری کر دیا جائے گا۔ اور سالنامہ بھی بالکل مفت ملیگا۔ ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء تک ہفتہ وار اخبار گلفروش طلبا، اور قومی و اسکول کی لائبریریوں کے نام صرف دو روپئے چار آنے سالانہ میں جاری کر دیا جاوے گا بشرطیکہ زرچندہ بذریعہ منی آرڈر موصول ہو۔ نمونہ کا پرچہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر منگوائیے۔

منیجر ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی

مسائلِ زر جدید روشنی میں

نظریۂ تعدادِ زر کی غیر معقولیت[1]

(بسلسلۂ جون)

قدیم معاشیین نے "نظریۂ تعدادِ زر" یا (Quantity theory of money) پر بہت زور دیا ہے۔ اور صفحے کے صفحے اس مسئلہ پر سیاہ کئے ہیں۔ دراں حالیکہ اگر جدید روشنی میں اس نظریہ کو پرکھا جائے تو اس کی کچھ حیثیت باقی نہیں رہتی۔

زر کی قدر سادہ الفاظ میں "نظریۂ تعدادِ زر" کی تفصیل یہ ہے کہ زر کی قیمت دوسری تمام چیزوں کی طرح "طلب" اور "رسد" کے توازن سے متعین ہوتی ہے۔ مثلاً اگر "طلب" ایک کرور روپیہ کی ہے اور "بہم رسانی" صرف پچاس لاکھ روپئے کی۔ تو ظاہر ہے کہ ایک روپیہ کی وقعت دو روپیہ کے برابر ہوگی۔ کیونکہ جب کوئی چیز "طلب" سے کم ہو تو اُس کی قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔

زر کی "طلب" کا حال صرف رائج الوقت نوٹوں اور سکّوں کی تعداد سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ کیونکہ ایک سکّہ یا نوٹ ایک سے زیادہ دفعہ سودا کرنے میں مستعمل ہوتا ہے اس لئے صحیح طلب کا اندازہ لگانے کے لئے زر کی کل تعداد کو "رفتارِ گردش" (Velocity of Circulation) سے بھی ضرب دینا پڑے گا۔ مثلاً اگر ایک سکّہ دس دفعہ سودا خریدنے یا تجارت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اُس کو ہم دس سکّے شمار کریں گے کیونکہ اُس نے دس سکّوں کا کام کیا۔ اسی طرح اُن کاغذات کی بھی جو بطور زر مستعمل ہوتے ہیں صحیح تعداد معلوم کرنے کے لئے کل تعداد کو رفتارِ گردش سے ضرب دینا پڑے گا۔

اسی طرح زر کی "مانگ" یا "طلب" کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اُن سودوں کی تعداد معلوم کرنا پڑے گی جو زر کے ذریعہ سے انجام پاتے ہیں۔ اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ تمام روپیہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کاروبار کے لئے استعمال

---

[1] اس مضمون کے لئے میں سب سے زیادہ اپنے محترم پروفیسر اندر موہن کپور ایم۔ ایس۔ سی اکونامکس (لندن) کے خیالات کا مرہون منت ہوں۔ علاوہ ازیں میں نے کینن۔ ٹاؤزے۔ مل۔ سڈوگ۔ مارشل۔ پیگو۔ کیینز اور فشر کی گرانقدر کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن کے حوالے جا بجا درج کر دئے ہیں۔

ہوتا ہے اس لئے طلبِ زر کا مقصد سوائے کاروبار اور تجارت کے کچھ نہیں۔

اب اگر زر کی بہم رسانی کو اُس کی طلب پر تقسیم کر دیا جائے۔ تو حاصل تقسیم زر کی قدر ہوگی۔ مثلاً اگر کل زر (یعنی تعداد زر رفتار گردش) پانچ لاکھ روپیہ ہے اور اُس سے کاروبار دس لاکھ روپیہ کا کیا جاتا ہے تو زر کی قیمت ظاہر ہے کہ ۱/۲ روپیہ ہوگی

اسی خیال کو امریکی ماہر مالیات فشر (Fisher) نے ایک فارمولا کی صورت میں یوں بیان کیا ہے :-

$$\text{ت}_{\text{ل}} \times \text{ر} \times \text{ت}_{\text{ک}} = \text{ق} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{ت}_{\text{ل}} \times \text{ر} \times \text{ت}_{\text{ک}}}{\text{ک}} = \text{ق}$$

نظریۂ تعدادِ زر نظریہ تعدادِ زر کے حامی کہتے ہیں کہ اگر باقی حالات بدستور رہیں۔ یعنی زر کی طلب۔ آبادی۔ صرافہ۔ کاروبار۔ ذرائع نقل و حرکت۔ وغیرہ میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو زر کی قیمت کا انحصار معکوسی نسبت (Inverse Proportion.) سے اُس کی تعداد پر ہوگا۔

مثلاً اگر باقی حالات نہ بدلیں اور زر کی تعداد دُگنی ہو جائے تو لازماً اُس کی قیمت پر اس کا اُلٹا اثر ہوگا اور وہ پہلے سے نصف رہ جائے گی۔ اور باقی اشیاء کا نرخ بھی چڑھ جائے گا۔ یہ اس لئے کہ جب کسی شے کی بہتات ہو جاتی ہے تو اُس کی وقعت اور قدر و قیمت جاتی رہتی ہے۔ اور جب زر کا یہ حال ہوگا تو عام اشیاء کی خرید کے لئے اُس کی زیادہ تعداد میں ضرورت پڑے گی۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ اشیاء کا بھاؤ تیز ہے۔

فرض کیجئے آج ہمارے ملک میں کل سکے اور کاغذاتِ زر ایک کروڑ کی تعداد میں گھوم رہے ہیں کل اگر اُن کی تعداد دو کروڑ کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ ہر سکہ اور کاغذ کی قدر پہلے سے نصف رہ جائے گی یعنی وہی شے جو پہلے ہم ایک روپیہ میں خرید سکتے تھے اب دو روپیہ میں خریدی جا سکے گی۔

پس حامیانِ نظریہ کی رو سے زر کی قیمت کا انحصار اُس کی تعداد پر ہے۔ بشرطیکہ حالات بدستور رہیں اور اُنکا خیال ہے کہ اگر زر کی تعداد میں کوئی تغیر پیدا کر دیا جائے تو اُس کا اُسی نسبت سے اُلٹا اثر اُس کی قدر پر پڑے گا۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو نظریۂ تعدادِ زر کی بنیاد مندرجہ ذیل مفروضات پر قایم ہے :-

۱- دیگر حالات بدستور رہیں۔

۲- چونکہ تمام زر، اموال و خدمات حاصل کرنے کے لئے صرف کیا جاتا ہے اس لئے اُس کی مانگ، تجارتی کاروبار کی وسعت پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں زر کی طلب بالواسطہ ہے اور وہ محض اموال و خدمات کے حصول کے لئے درکار ہے۔

۳- کل زر معلوم کرنے کے لئے تعداد کو اُس کی رفتارِ گردش سے ضرب دینا پڑے گا۔

لہ یہاں ت کے معنی تعدادِ زر بصورت سکہ۔ ر کے معنی رفتارِ گردش۔ ت کے معنی تعدادِ زر بصورت کاغذات۔ ر کے معنی کاغذات کی رفتارِ گردش۔ ک کے معنی کاروبار۔ ق کے معنی قیمت یا قدر۔

۴۔ طلب زر کی لوچ اکائی سے (Unitinelastic تا Elastic)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مفروضات میں کس حد تک صداقت ہے۔

دیگر حالات بدستور

جہاں تک "دیگر حالات کے بدستور" رہنے کا سوال ہے اول تو یہ بالکل غیر مصدقہ اور ناممکن الوجود ہے۔ کیونکہ علمی دنیا میں کبھی مشاہدہ میں نہیں آیا کہ آبادی ساکن رہے مزاق کی حالت نہ بدلے۔ ذرائع رسل و رسایل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ تجارت اور کاروبار اُسی پیمانہ پر رہے اور زر کی طلب میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ پس اُنہونی باتوں کو فرض کرنا لایعنی ہے۔ اور چونکہ سارے نظریہ کا انحصار صرف اسی مفروضہ بات پر تھا۔ اس لئے جب اس کی تغلیط ہوگئی تو وہ خود بخود باطل ٹھہرا۔

دوسرے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ محض نظریہ تعدادِ زر میں "دیگر حالات کے بدستور" رہنے کی آٹ لینے میں کیا حکمت ہے؟ یہ الفاظ استعمال کرکے تو ہر شے کے بارہ میں اس نظریہ کی حقانیت ثابت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً گندم اور روئی کی قیمت بھی "دیگر حالات کے بدستور" رہنے کے بعد اُن کی بہم رسانی پر مبنی ہوگی۔ پس سوال یہ ہے کہ زر کے بارہ میں اس فقرہ کے استعمال سے نئی بات کونسی پیدا ہو جاتی ہے؟۔

طلب زر کی غرض

قدماء کے نزدیک زر محض اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ اُس کے ذریعہ سے اموال و خدمات حاصل کی جائیں۔ چونکہ زر بذاتہ کوئی احتیاج پوری نہیں کر سکتا۔ اس لئے اُسکا مقصد مفید یہی سمجھا جاتا ہے، کہ اُس کے ذریعہ سے دیگر اشیاء خریدی جائیں۔ چنانچہ مل کی تقلید میں ٹاوزے نے لکھا ہے کہ:۔

"اگر ایک کنجوس اور دیگر ایسے ہی اشخاص کو جو زر کو محض زر کی خاطر جمع کرنے میں مستثنیٰ کر دیا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ روپیہ خواہ وہ کثیر ہو یا قلیل، جلد یا بدیر، ضرور خرچ کر دیا جائے گا۔ اس کی طلب۔ یعنی جو اُس کے بدلہ میں پیش کیا جاتا ہے — اشیاء اور اموال پر مشتمل ہوتی ہے"[1]۔

مل نے بھی اِس خیال کو یوں ظاہر کیا تھا:۔

"زر کی مانگ تمام قابل فروخت اموال پر مشتمل ہوتی ہے"[2]

یہ خیال کہ زر محض اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ اُس کے ذریعہ اموال و خدمات حاصل کی جائیں اب پروفیسر ایجورتھ کینین نے مسترد کر دیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے ثابت کیا ہے کہ زر کی طلب محض اشیاء کی خرید پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اُس نقدی پر بھی محمول کی جا سکتی ہے جو افراد یا بنک یا دیگر ادارے اپنے پاس عارضی طور پر محفوظ رکھیں۔

---

[1] اصول معاشیات جلد اول صفحہ ۲۳۲/۳۳۴ تیسرا ایڈیشن — [2] معاشیات سیاسیہ سڈوگ صفحہ ۲۳۹ سنہ ۱۹۰۴ء

اس خیال کے آثار مارشل (Marshall) اور پیگو (Pigou) کی تحریرات میں بھی ملتے ہیں، مثلاً مارشل نے اپنی کتاب "زر، قرض اور قیمتیں" میں لکھا ہے:۔

"اگر دیگر حالات بدستور رہیں تو اگرچہ زر کی اکائی کی قیمت اُس کی تعداد کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔ تاہم اگر ناقابلِ تحویل کاغذی نوٹ زیادہ تعداد میں جاری کر دئے جائیں تو اُس کی وقعت کم ہو جائے گی اور اس کے نتیجہ میں اُس نقدی کی تعداد بھی گھٹ جائے گی جو لوگ اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں"[1]

ظاہر ہے کہ مارشل کے نزدیک اُس نقدی کا بھی "جو لوگ اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں" زر کی قدر پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن پھر بھی مارشل نے یہ کہیں نہیں کہا کہ طلب زر، رقم کی عارضی ملکیت کے مرادف ہے (That demand comes from holding)۔ پیگو اپنے بیان میں قدرے صاف ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جب ایک شخص محض اپنی ساکھ اور ناداری کے طفیل اپنی زیر باریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تو یقیناً اُس کو تکلیف رہتی ہے اس لئے وہ اپنے روزمرہ کی ضروریات کے لئے (خواہ وہ نرخوں کے چڑھنے کی وجہ سے ہو یا کسی لابدی احتیاج کی وجہ سے) کچھ ذرائع قابلِ قبول زر کی شکل میں اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لئے بیقرار ہوگا اور یہی زر کی طلب ہے"[2]۔

لیکن ان قدیم مصنفین کی تحریرات کے باوجود اس مسئلہ کی وضاحت کرنے کا اوّلین سہرا ایڈون کینن کے سر پر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر طلبِ زر (Demand for money) ملکیت زر (Holding of money) کے مرادف ہو تو اس میں اور زر کی بہم رسانی کی تعریف میں فرق ہی کیا رہا۔ کیونکہ زر کی بہم رسانی ہی تو وہ رقم ہے جو بنک یا دیگر ادارے اپنے پاس رکھتے ہیں۔

لیکن حق یہ ہے کہ اس طرح ہر شے کی "طلب" اور "رسد" مرادف ثابت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً مکانات کی مانگ کمینوں کی طرف سے آتی ہے اور اُن کی بہم رسانی بھی وہ مکانات ہیں جن میں لوگ رہتے ہیں۔ بس اس لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مکانات میں بعض خالی بھی رہتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی حال زر کا ہے۔ پاس رکھے ہوئے زر میں سے کچھ حصہ بیکار بھی رہتا ہے۔

مطالبہ زر بلاواسطہ بھی ہے

پھر سب سے بڑا اعتراض اس جدید نظریہ کے خلاف یہ کیا جاتا ہے کہ زر بذاتہٖ کوئی احتیاج پوری نہیں کرتا۔ اُس کی طلب کا واحد مقصد اموال و خدمات کا حصول ہی درانحالیکہ یہ بالکل غلط ہے۔ زر کا استعمال بلاواسطہ بھی ہو سکتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۴۷ ایڈیشن ۱۹۲۳ء ۔ [2] علمی معاشیات صفحہ ۵۹، ۵۹

مثلاً جب کوئی شخص اپنے پاس زر محض اس لئے محفوظ رکھتا ہے کہ وہ اُسے کسی فقیر کو دے۔ یا اپنے بیٹے کو دے یا اپنی لڑکی کے جہیز کا انتظام کرے تو اُسوقت وہ زر محض اس لئے طلب نہیں کر رہا ہوتا کہ اُس سے وہ اموال و خدمات خریدیگا۔ اسی طرح وہ کنجوس جو محض زر کی چمک دمک اور اُس کی جھنکار سے محظوظ ہونے کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے اموال و اشیاء خریدنے کے لئے ایسا نہیں کرتا بلکہ اُس کی طلب بلاواسطہ ہوتی ہے۔

شاید کوئی کہدے کہ چونکہ یہ فقیر اور لڑکا اور لڑکی، بالآخر اس روپیہ سے اموال و اشیاء ہی خریں گے اس لئے ثابت ہوا کہ طلبِ زر کی غرض محض اموال و خدمات کا حصول ہے۔

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ جہاں تک اُس شخص کی طلبِ زر کا معاملہ تھا جو یہ روپیہ فقیر یا لڑکے اور لڑکی کو دیتا ہے وہ اُسی وقت ختم ہو گیا جب اُس نے یہ رقم اپنی جیب سے نکالی۔ اب یہ پانے والوں کی اپنی مرضی ہے خواہ وہ اسے دریابُرد کریں یا اس سے اموال و خدمات حاصل کریں۔

بہرحال اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ طلبِ زر اموال و اشیاء کی خرید سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُس عارضی ملکیت سے پیدا ہوتی ہے جو ایک شخص پیگو کے الفاظ میں عام کاروبار کرنے اور غیر متوقع ضروریات پورا کرنے کے لئے اپنے زر پر رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں زر کی طلب بلاواسطہ بھی ہے۔ اور معاشی ضروریات کے علاوہ اُس کا معاشرتی۔ مذہبی اور اخلاقی مصرف بھی ہے۔

مطالبہ بملکیتِ زر سے پیدا ہوتا ہے

لیکن بفرضِ محال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ زر کی غرض محض اشیاء کی خرید ہے تو بھی ملکیت کے نظریہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اور یہ مندرجۂ ذیل توضیحات سے ظاہر ہے۔

(۱) آپ زر کیوں طلب کرتے ہیں؟ آخر آپ اُسے کھا، یا پہن تو سکتے نہیں۔ ذرا سے غور کے بعد آپ پر واضح ہو جائیگا کہ آپ زر کی محض اس لئے خواہش کرتے ہیں کہ آپ اُسے کسی اور کو دینا چاہتے ہیں خواہ اُس کے بدلہ میں آپ کو کوئی شے ملے یا نہ ملے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کی حیثیت محض ایک تاجر کی ہوتی ہے جو اشیاء اس لئے طلب کرتا ہے تاکہ دوسروں کو مہیا کرے۔ پس جب آپ کے پاس رقم عارضی طور پر رہتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی طلب زر ملکیتِ زر کے مرادف ہے اور آپ روپیہ محض اس لئے طلب کرتے ہیں تاکہ اُسے کسی اور کو دیں۔

(۲) اگر یہ صحیح ہو کہ طلبِ زر اموال و خدمات کے لئے پیدا ہوتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جب اموال و اشیاء کی تعداد ملک میں بڑھ جائے تو زر کا مطالبہ اُسی نسبت سے نہیں بڑھتا؟ بلکہ لوگ تو گورنمنٹ سے یہ کہنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں کہ "برائے مہربانی زیادہ سکے یا نوٹ جاری نہ کیجئے تاکہ ہم اُسی رقم سے جو ہمارے پاس پہلے ہی موجود ہے زیادہ اموال و خدمات حاصل کر سکیں"۔

اسی طرح جب تجار و صناع اپنا مال بیچتے ہیں تو کیا اُن کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ انھیں اپنی اشیاء کے بدلہ میں زیادہ رقومات حاصل ہوں اور کیا وہ گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ وہ زیادہ سکّے ڈھالے اور نوٹ جاری کرے؟

اکثر اوقات گورنمنٹ زیادہ نوٹ جاری بھی کر دیتی ہے لیکن اُس کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ زر کا مطالبہ بڑھ گیا ہے بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گورنمنٹ زیادہ سکّے جاری کرکے اشیاء کی کمی کے باعث زر کی قیمت میں جو اضافہ ہونے کا خدشہ ہے اُس کو دور کرنا چاہتی ہے۔

پس اگر طلبِ زر اموال و خدمات کے حصول کے لئے ہوتی تو اُس کی تعداد کو انہی کی کمی و بیشی کے ساتھ بڑھنا گھٹنا چاہیئے تھا۔ اور چونکہ یہ نہیں ہوتا اس لئے ثابت ہوا کہ زر کی طلب اموال سے پیدا نہیں ہوتی۔

دراصل تو زر کی رسد اس لئے بڑھتی ہے کہ اُس کا مطالبہ بڑھ گیا ہے اور نہ مطالبہ اس لئے بڑھتا ہے کہ اموال و خدمات کی تعداد زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اکثر اوقات گورنمنٹ صرف اس لئے بھی زر کی تعداد میں اضافہ کر دیتی ہے کہ اُسے جنگ کے مصارف پورا کرنے مدِ نظر ہوتے ہیں یا وہ قرضہ جات کی شرحِ سود گھٹانا چاہتی ہے وغیرہ۔

اسی طرح جب وہ زر کی بہم رسانی گھٹاتی ہے تو اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی کہ اموال و خدمات کی تعداد کم ہو گئی ہے بلکہ بسا اوقات وہ اس طرح تخمینہ اور قیاس کی مذموم عادت کو روکنا چاہتی ہے۔

دوسری طرف ایک عام شخص کے پاس اموال و خدمات کی کمی و بیشی معلوم کرنے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خرید و فروخت کے لئے قیمتوں کو دیکھتا ہے۔ اور اُنھیں کے مطابق اپنے پاس کچھ (زیادہ یا کم) زر محفوظ رکھتا ہے۔ اُس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ قیمتیں اموال کی تعداد میں فرق آنے سے تبدیل ہوتی ہیں یا زر کی بہم رسانی کے تغیر کا نتیجہ ہیں۔

درحقیقت قیمتوں کے تغیر کا باعث صرف اموال یا زر کی بہم رسانی میں تبدیلی نہیں بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے مطالبہ میں کمی و بیشی بھی ہے۔ پھر زر اور اموال کے مطالبہ میں یہ کمی و بیشی بھی ان کی پیداوار یا ساخت پر مبنی نہیں بلکہ اسکا باعث جنگ یا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

پس اموال و اشیاء کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ضروری طور پر یہ معنی نہیں کہ اب زر کی بہم رسانی بھی زیادہ ہو جائیگی یا زر کا مطالبہ بھی بڑھ جائے گا اور اس سے ثابت ہوا کہ اموال کی تعداد زر کی طلب کا باعث نہیں ہوتی۔ زر کی طلب صرف اُسوقت بڑھتی ہے جب لوگ عام اشیاء کی بجائے زر زیادہ تعداد میں اپنے پاس رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف زر کی بہم رسانی میں بھی اضافہ کے یہ معنی نہیں کہ اب اموال و خدمات کا مطالبہ بڑھ جائے گا۔

(۳) کسی شے کی طلب اُسوقت بڑھتی ہے جب لوگ اُس کے لئے پہلے سے زیادہ فی اکائی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور وہ اُسوقت بھی بڑھتی ہے جب قیمت میں کمی کی وجہ سے اُس شے کے مطالبہ میں اس کمی کی نسبت زیادہ اضافہ ہو۔ لیکن جب قیمت میں کمی یا بیشی ہو اور طلب وہی رہے تو اسے "غیر لچیلا مطالبہ" کہتے ہیں۔

(Static Demand) اور اگر طلب میں اضافہ یا کمی ہو لیکن قیمت وہی رہے تو اسے "استقراری مطالبہ" (Constant Demand) کہتے ہیں۔

اِن حقایق کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب اموال و اشیاء کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے تو اُسکا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

مستعلین زیادہ زر کا مطالبہ نہیں کرتے لیکن صناعین اور تجار کو اس کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صناعین کے مطالبۂ زر میں اضافہ ہو گیا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ اُن کو فی اکائی زر زیادہ اموال و اشیاء پیش کرنی پڑیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ کم قیمت پر زیادہ اشیاء فروخت نہیں کرنا چاہتے۔

اُن کو زائد روپیہ کی خواہش بالکل بزنس مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اُنہیں مزید روپیہ کے لئے زیادہ قیمت دا دا کرنی پڑے۔ یا یوں کہئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُنھیں زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے اپنا مال سستے داموں پر فروخت نہ کرنا پڑے۔

برخلاف اس کے جب زر کی قیمت میں انحطاط پیدا ہوتا ہے اور عام اشیاء کا نرخ چڑھ جاتا ہے تو لوگوں کا مطالبۂ زر زیادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ نرخ کی تیزی سے ڈر کر زر کا بیشتر حصہ اپنے پاس محفوظ رکھنا شروع کر دیتے ہیں اور اُسے خرچنے میں تامل کرتے ہیں

پس لوگوں کا مطالبۂ زر بھاؤ کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اموال و اشیاء کی پیداوار اُس پر کچھ اثر نہیں ڈالتی۔

اگر اب بھی کوئی متذکرہ بالا نظریہ سے مطمئن نہ ہو تو اُسے مندرجۂ ذیل دو سوالوں کا جواب دینا چاہئے۔

۱۔ کیا ۲۲-۱۹۲۰ء میں جرمنی کے لئے جو طلب بڑھی تھی وہ اس لئے تھی کہ لوگ اُس سے اموال و اشیاء خریدنا چاہتے تھے۔

۲۔ کیا اُن اشیاء کی پیداوار کے اضافہ سے جو جرمنی کا تاوان ادا کرنے کے لئے ہوا تھا جرمنی کے زر کے لئے طلب بڑھ گئی تھی؟

اگر نہیں تو آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ "مطالبۂ زر" کا تعلق اشیاء کی پیداوار اور ساخت سے ہے؟

پس خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ مطالبۂ زر اشیاء و اموال کی خرید و فروخت سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ مشتمل ہے اُن رقوم پر جو ایک شخص اپنے پاس عارضی طور پر رکھتا ہے اور اس لحاظ سے حامیان "نظریۂ تعدادِ زر" کا یہ خیال کہ طلبِ زر ہمیشہ بالواسطہ ہوتی ہے بالکل غلط ہے۔

رفتارِ گردش | "نظریۂ تعدادِ زر" کے مخترعین کا خیال ہے کہ اگر کسی وقت زر کی کل بہم رسانی کا اندازہ لگانا ہو تو نوٹوں اور سکوں کی تعداد کو اُس رفتار سے ضرب دینا چاہئے جس سے وہ کاروبار کے سلسلہ میں گھومتے ہیں۔

میں نے اکثر اس مسئلہ پر غور کیا ہے لیکن کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زر کی قدر معلوم کرنے کے سلسلہ میں "رفتارِ گردش" کے سوال کو اُٹھانے کی کیا حکمت ہے؟ دوسری اشیاء کی قیمت کا تعین کرنے کے سلسلہ میں اس مسئلہ کو کیوں نہیں چھیڑا جاتا؟ آخر زر اور دوسری اشیاء کے درمیان کیا فرق ہے کہ اُن کی قدر معلوم کرنے کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اُصول مقرر ہوں؟

پروفیسر کینن نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور اس گتھی کو یوں سلجھایا ہے کہ اُس کے نزدیک "رفتارِ گردش" کا نظریہ "مطالبۂ زر" کے نظریہ سے کچھ مختلف نہیں ہے بلکہ یہ دونوں باتیں اصل میں ایک ہی ہیں[1]۔

پروفیسر کینن کہتا ہے کہ جب آپ کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو یا تو اُسے اپنے پاس رکھتے ہیں یا اُسے استعمال کرتے ہیں۔ جب آپ کی طلب یا خواہش پوری ہو جاتی ہے تو آپ اُسے فروخت کر دیتے ہیں یا کسی اور شخص کو دیدیتے ہیں۔

یہی حال زر کا ہے۔ جب آپ اُسے اپنے پاس رکھے ہوتے ہیں تو دوسرے الفاظ میں آپ کو اُس کی طلب ہوتی ہے اور جتنی زیادہ دیر تک آپ اُسے اپنے پاس رکھیں گے اُتنی کم رفتار سے وہ گھومے گا۔ یا لوگوں میں گردش کرے گا۔

یہی خیال ایک اور طریق سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ جتنی زیادہ لوگوں کی "ملکیتِ زر" ہوگی اُتنے ہی زیادہ عرصہ تک لوگ اسے اپنے پاس رکھنا پسند کریں گے اور اُتنی ہی کم اُس کی رفتارِ گردش ہوگی۔

پس اگر دیگر حالات بدستور رہیں تو جتنا زیادہ "مطالبۂ زر" ہوگا یعنی جتنی زیادہ دیر تک لوگ اپنے پاس رقم رکھیں گے اُتنی ہی کم رفتار سے زر کی گردش ہوگی۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ رفتارِ گردش پر اثر انداز ہونے والی قوتیں اُن قوتوں سے مختلف نہیں ہیں جو لوگوں کی ملکیتِ زر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

پس رفتارِ گردش معلوم کرنے کے لئے بجائے اس کے کہ ہم یہ دریافت کرتے پھریں کہ ایک سکہ نے کتنے سودے چکائے ہمیں صرف وہ اوسط رقم دریافت کرنا پڑے گی جو لوگ اپنے پاس کسی وقت میں رکھتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ "رفتارِ گردش" کا نظریہ "مطالبۂ زر" کے نظریہ سے کچھ مختلف نہیں ہے اس لئے اس کو زر کی بہم رسانی کے ساتھ منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ "گردش" مطالبہ سے کوئی علٰحدہ شے نہیں ہے جس کا زر کی قدر پر کوئی اثر پڑ سکے بلکہ وہ تو خود "مطالبہ" ہے۔

طلبِ زر کی لوچ[2]

یہ خیال کرکے کہ طلبِ زر کی غرض محض اموال و اشیاء کی خرید ہے مخترعین "نظریۂ تعدادِ زر" نے ایک بڑی غلطی کی ہے یعنی زر کی طلب کو استقراری یا اس کی لچک کو اکائی قرار دیدیا

چنانچہ ٹاؤسز لکھتا ہے:۔

"کسی ملک یا ملک کے کسی خاص قوم کے لوگوں کا مطالبۂ زر استقراری ہوتا ہے وہ قیمتوں کے چڑھنے یا گرنے سے

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۲ ایڈیشن ۱۹۲۹ء۔ [2] The elasticity of demand for money

متغیر نہیں ہوتا۔ خواہ مال زیادہ نرخ پر فروخت ہو یا کم پر وہ بہرحال بیچ دیا جائے گا اور زیادہ تر زر کے عوض، دوسرے الفاظ میں مطالبۂ زر کی لچک اکائی ہے۔ اور زر کی قدر کا قابلِ فروخت اشیاء پر کوئی اثر نہیں ہوتا زر کی تعداد وہی رہتی ہے جو قابلِ فروخت اشیاء کی میزان ہے"۔[1]

مطالبۂ زر کی لچک اکائی جب ہی قرار پا سکتی ہے اگر سارے کا سارا زر صرف اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے مستعمل ہو۔ لیکن چونکہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ زر کا مصرف محض خرید و فروخت نہیں بلکہ بعض دیگر ضروریات بھی ہیں اس لئے ٹاؤزگ کا یہ خیال کہ "زر کی تعداد وہی رہتی ہے جو قابلِ فروخت اشیاء کی میزان ہے" درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دوسرے یہ کہنا غلط ہے کہ زر کی قدر کا قابلِ فروخت اشیاء پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات زر کی قیمت کے چڑھنے سے پیدائش دولت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور بعض اوقات حوصلہ فرسائی۔ ہم صحیح اثر کا تعین تو نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ قوم کے رجحانِ طبع پر منحصر ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ پیدائش دولت پر زر کی قدر کا اثر یقیناً پڑتا ہے۔ مثلاً اگر زر کی تعداد زیادہ کر دی جائے تو شروع شروع میں دولت آفرینی کو تقویت پہونچے گی اور بعض اوقات اس کا نتیجہ اختراعات اور ایجادات بھی ہوگا پھر مستقل طور پر اُس سے پیدائشِ دولت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس بات کے لئے کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہ ترقی بعینہٖ اُسی نسبت سے ہوگی جس نسبت سے کہ زر کی تعداد بڑھی ہے۔ بعد میں جب "افراطِ زر" کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو جائیں گے اور زر کی قیمت میں انحطاط واقع ہوگا تو پیدائشِ دولت کو بھی زک پہونچے گی اور اُس کی حوصلہ فرسائی ہوگی۔ اس مرحلہ پر لوگ بجائے فروخت کرنے کے مال اپنے پاس محفوظ رکھنا شروع کر دیں گے اور مزید ساحت کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ پس جیسا کہ ٹاؤزگ کہتا ہے یہ ضروری نہیں کہ قابلِ فروخت اشیاء کی وہی میزان رہے جو زر کی ہے کیونکہ مال کی میزان میں اور زر کی قدر میں کمی و بیشی کے مطابق فرق آتا رہتا ہے۔ اس لئے مطالبۂ زر استقراری نہیں کہلا سکتا۔

پھر واضعینِ "نظریۂ تعدادِ زر" کا خیال ہے کہ چونکہ مطالبہ زر قیمتوں کے چڑھنے یا گرنے سے متغیر نہیں ہوتا اس لئے وہ "استقراری" ہے حالانکہ اس توضیح کے لحاظ سے اُسے "غیر لچیلا" (inelastic) کہنا چاہئے تھا۔[2]

"استقراری" مطالبہ تو وہ ہوتا ہے جو بھاؤ کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق اُسی نسبت سے کم یا زیادہ ہو۔ لیکن یہاں چونکہ مطالبۂ زر متغیر نہیں ہوتا اس لئے اُسے بالبداہت انھیں مصنفین کے الفاظ میں "غیر لچیلا" کہنا چاہئے تھا۔

ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ جدید خیالات کی رو سے مطالبۂ زر مال کی خرید و فروخت پر مشتمل نہیں ہے۔ دولت آفرینی کی کمی و بیشی اُن موثرات میں سے صرف ایک ہے جو لوگوں کو اس بات کے فیصلہ کرنے میں امداد دیتے ہیں کہ انھیں کتنی رقم اپنے

---

[1] "اصول معاشیات" جلد اول صفحہ ۲۳۴ ایڈیشن ۱۹۲۱ء

[2] مارشل۔ اُصول معاشیات صفحہ ۱۰۲ ایڈیشن ۱۹۲۰ء اور ٹاؤزگ اُصول معاشیات صفحہ ۱۳۸، ۱۹۲۷ء

پاس محفوظ رکھنی چاہیئے۔

دیہاتی حالات سے صنعتی حالات کی طرف تبدیلی۔ ذرائع نقل و حرکت اور رسل و رسایل میں ترقی۔ تجارت خارجہ کی کمی و بیشی جنگ و امن کے احتمالات۔ افراطِ زر اور تفریطِ زر۔ پس اندازی کی عادت میں تبدیلی اور دیگر اسی قسم کے تغیرات ایسی باتیں ہیں جو لوگوں کے مقبوضہ زر پر اثر انداز ہوتی ہیں پس یہ معلوم کرنا کہ لوگ اپنے پاس کتنا روپیہ محفوظ رکھنے کے لئے تیار ہیں محض اموال و اشیاء کی صنعت و پیدائش سے ممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ یہ مؤثرات اتنے کثیر اور پیچیدہ ہیں اسلئے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ لوگ اپنے پاس تعدادِ زر کے مطابق کم یا زیادہ رقوم رکھنے کے لئے تیار ہونگے اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جمع شدہ رقم کا پیدائشِ دولت پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

پس مطالبۂ زر استقراری یا زر کی لچک اکائی نہیں قرار دیجا سکتی — اس نتیجہ کا "نظریۂ تعدادِ زر" پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہ نظریہ زیادہ تر اسی مفروضہ بات پر مبنی ہے کہ مطالبۂ زر استقراری یا اکائی ہے۔ اور چونکہ مطالبہ استقراری ہے اس لئے زر کی قیمت کا معکوسی طور پر انحصار اُس کی تعداد پر ہے لیکن چونکہ ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مطالبۂ زر استقراری نہیں ہے اسلئے سارے نظریہ کا کھوکھلا پن واضح ہو گیا۔

عبدالرحیم شبلی (بی۔ کام)

مطبوعات جدیدۂ ایران

کتب ذیل کتابخانہ ایرانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شائقین علم و ادب جلد متوجہ ہوں کیونکہ تعداد تھوڑی رہ گئی ہے۔ کتب مطلوبہ کی نصف یا پوری قیمت پیشگی ارسال فرمائیں۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

(۱) دیوان شہریار مجلد با مقدمہ بقلم آقای ملک الشعرا بہار عہ ۱۲ر — (۲) دیوان حکیم منوچہری دامغانی مجلد عہ ۴ر — (۳) احوال و اشعار خاجوی کرمانی بقلم سعید نفیسی عہ ۸ر (۴) دیوان کامل ادیب الممالک فراہانی بتدوین و تصحیح و حواشی وحید دستگردی عہ ۸ر — (۵) دیوان مغربی تبریزی عہ ۸ر — (۶) دیوان میرداماد طبع اصفہان عہ ۸ر (۷) خزائن الاشعار من افکار آقا سید عباس جوہری عہ ۸ر — (۸) سلامان و ابسال جامی با مقدمہ بقلم آقای رشید یاسمی عہ ۸ر — (۹) حقیقت عالم بتصور بشر تصنیف علی رضا خان شمشیر وزیری ہے — (۱۰) نامۂ پیروزی اثر کاظم رجوی ۱۴ر (۱۱) شیراز نامہ تصحیح و اہتمام بہمن کریمی ہے — (۱۲) مانی نقاش تصنیف صنعتی زادہ کرمانی عہ ۸ر — (۱۳) ایرانیان در گزشتہ و حال از آقای مرزا حسین خان انصاری عہ ۸ر — (۱۴) ناپلیون و اسلام از آقای مرزا عباس خان ۱۲ر — (۱۵) گل ہائے خنداں بقلم مشہور ترین نویسندگان و مترجمین عہ ۸ر — (۱۶) جوان ناکام نگارش فتح اللہ دیدہ بان ۱۴ر — (۱۷) ملکۂ آسمان از سید محمد خان ہلنی ۱۲ر — (۱۸) دیوانہ نگارش سید حسین کبیر طبع رشت ۱۲ر — (۱۹) روح پروانہ اثر طبع آقای دکتر محمد حسین خان شہریار ۸ر (۲۰) معشوقۂ فراری بقلم تنہ خنداں ۱۲ر —

منیجر کتابخانۂ ایرانی۔ مزنگ۔ لاہور۔

چند خطوط

میرے ایک بہت پُرانے دوست ہیں۔ چند روز پیشتر ملاقات ہوئی تو جیب میں سے کچھ کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دئے میں نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟" بولے۔ "میرے عہدِ محبت کی یادگار"۔ میں نے اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ پُرانے خطوط ہیں۔ اُسوقت کے جب یہ کسی لڑکی سے محبت کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست نے ان کو لکھے تھے۔ میں اس رومان سے اچھی طرح واقف تھا اور راقمِ خطوط کی شخصیت بھی میرے لئے نئی نہ تھی کیونکہ وہ ایک بہت پُرانے شاعر ہیں اور آجکل افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہو رہے ہیں۔ لیکن ان خطوط کا مجھے علم نہ تھا۔ میں نے کہا "خوب، لیکن پہلے تو تم نے کبھی یہ دکھائے نہیں"۔ ہنسنے لگے۔ "میرے پاس تھے ہی کہاں جو دکھاتا۔ آج اتفاقاً ایک کتاب میں رکھے ہوئے مل گئے"۔ میں نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا۔ چار پانچ تو تھے ہی۔ پندرہ منٹ میں دیکھ ڈالے۔ وہ بولے "ہے نہیں ایک اچھا خاصہ افسانہ؟" میں نے کہا۔ "بیشک، کہو تو کسی رسالے میں چھپوا دوں"۔ اچھل پڑے۔ "بھئی بہت ہی اچھا خیال ہے! ضرور چھپوا دو۔ اور اپنی طرف سے ایک تمہید لکھ دینا۔ لیکن صاحب نام و مقام فرضی ہوں گے"۔ "وہ تو ہوں گے ہی"۔ میں نے کہا۔ بات طے پا گئی۔

اور اب میں اُن خطوط کو شائع کر رہا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اِن کا مطالعہ کریں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کے شایع کرنے سے میرا مقصد کیا ہے۔ میرے دوست نے تو یہ سوچا ہوگا کہ جب یہ خطوط ایک ادبی رسالے میں چھپیں گے تو اُنکی داستانِ محبت دنیا میں مشہور ہوگی اور اس طرح اُن کے نفس کو مسرور ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں ایک داستانِ محبت آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے کبھی عشق و محبت کے افسانے نہیں لکھے۔ میں ایسے افسانے لکھنا جنمیں انفرادیت اور داخلیت کا عنصر غالب ہو ایک سنجیدہ ادیب کا کام نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک زندہ اور جاندار ادب وہی ہے جس میں انسانوں کی اجتماعی زندگی کا جایزہ لیا جائے اور جس کی تخلیق ایک بلند اور شاندار مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب دماغی عیاشی ہے۔ غرضکہ ان خطوط کی اشاعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وصل و فراق کی ہزاروں مرتبہ دہرائی ہوئی داستان ایک دفعہ پھر دہرائی جائے۔

ان خطوط کا مصنف ایک بے نظیر انشا پرداز ہے۔ وہ اپنی جادو نگاریوں کے باعث دنیائے ادب میں لازوال شہرت کا مالک بن چکا ہے۔ یہ خطوط اُس کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ نہیں ہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ اس خیال سے لکھے ہی

مکتوباتِ نیاز

تمہارا خط ملا۔ کسقدر ظلم ہے کہ میں اب سے تیس سال اس طرف ہٹکر تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے "عشقِ حقیقی" کا درس دیتے ہو جسے میں آیندہ تیس سال کے بعد بھی سننا پسند نہیں کرتا۔

تم پہلے بھی باوجود کافر ہونے کے کافی نرا ہی تھے، لیکن اب یہ دیکھ کر خط کا آغاز تم "۷۸۶۔ نحمدہ ونصلی۔ اور ہدیۂ مسنون" سے کرتے ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں "پیر و مرشد" سے خطاب کروں یا "قبلہ و کعبہ" سے۔ معاذاللہ! کس قدر تکلیف دہ خیال ہے کہ وہ ہونٹ جو صرف جواب تلخ کے لئے وضع ہوئے ہوں، وہ پند و نصیحت کیلئے وقف ہو جائیں۔

یہ تم سے کس نے کہدیا کہ "عشقِ حقیقی" کوئی چیز ہے۔ یہ "محویت و فنا" کی مہمل اصطلاحیں تم نے کس سے سیکھیں۔ خدانخواستہ تم کسی کے مرید تو نہیں ہو گئے۔ میں نے تو تم میں حماقت کے یہ جراثیم کبھی نہیں پائے تھے۔ بیوقوف، یہ سب دھوکا ہے، دنیا میں اصل چیز صرف وہ ہے جسے زروئے مشاہدۂ ظاہری "میں اور تم"۔ کہتے ہیں۔ زیادہ خیال آرائی کی ضرورت نہیں۔ لذت وہی ہے جس کا تعلق انسان کے گوشت و خون سے ہے، مرنے کے بعد نہ روح باقی رہتی ہے نہ اس کا احساس اور اگر ایسا ہو تو جوانی کہاں؟

تم کہو گے کہ یہاں بھی تو شباب کا تعلق عمر سے ہے۔ میں کہوں گا صرف عمل سے۔ اسکردا علمڈ کہتا ہے اعادہ شباب کی تدبیر صرف یہ ہے کہ انسان پھر گناہ کرنے لگے اور گناہ کے لئے زیادہ استطاعت درکار نہیں۔ جرأت چاہئے اور تھوڑا سا سیلانِ خون۔

میں حیدرآباد جاتے ہوئے تم سے خرد رملوں گا لیکن اسوقت سے تم، اسوقت کے تم نہیں۔ اس وقت کی تصویر اپنی بھیجو، اسوقت کی تو میرے پاس ہے، میرے دل میں۔

صدیقی۔ خط ملا۔ یقیناً طبیعت بے کیف ہے، لیکن اتنی بے کیف بھی نہیں کہ آپ وہاں "آرایشِ خم کاکل" میں مصروف ہوں اور میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" سے بھی فارغ رہوں۔

آپ جس اہتمام جس شوق و ولولہ کے ساتھ کلکتہ جا رہے ہیں، وہ اگر ناکام رہے تو بھی میرے لئے باعثِ صد ہزار رشک ہے۔ آپ کو کیا خبر کہ "بیدست و پائی" کیا بلا ہے اور انسان کو اپنے اخلاق خراب کرنے میں اس سے کتنی مدد ملتی ہے۔

پاؤں میں قوتِ رفتار ہو اور میں نہ چلوں تو کوئی بات نہیں، لیکن پائے لنگ رکھنے کے بعد آپ کا سامنے سے اٹھلا اٹھلا کر گزرنا دیکھوں، قیامت ہے! ظاہر ہے کہ یہ انتہائی بداخلاقی ہے، لیکن یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ آپ ایک شخص کی مجبوریوں سے واقف ہونے کے بعد بھی اس کے "احساسِ بیچارگی" کو "تیز تر" کرتے رہیں۔ "بامِ بلند" پر بیٹھنے والوں کے لئے یہ کیا ضرور ہے کہ "کوتاہ کمند" رکھنے والوں کو بھی اوپر پہونچنے کی دعوت دیں

یہ سچ ہے کہ مجھے فرصت بھی حاصل ہے اور استطاعت بھی۔ لیکن وہ چیز کہاں سے لاؤں جو ——

"نہ بزور و نہ بزاری نہ بہ زری آید"

مطاعی الاعز۔ والا نامہ پہونچا۔ آپ نے جس باب میں میرا مشورہ طلب فرمایا ہے، وہ یقین فرمایئے کہ میری فہم سے بالاتر ہے۔ میں اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے نہایت معمولی انسان ہوں اور میری عقل کی پرواز میری نگاہ سے زیادہ نہیں۔ جو کچھ دیکھتا ہوں وہی سمجھتا ہوں اور آپ رائے طلب فرماتے ہیں ان باتوں میں جو میرے خیال کو بھی تھکا دینے والی ہیں، نگاہ کا کیا ذکر!

اس وقت تک دنیا میں مجھے صرف دو باتوں کا علم حاصل ہوا ہے۔ ایک کا تعلق خدا سے ہے اور دوسری کا اپنی ذات سے۔ وہ یہ کہ خدا کا انکار اس کی انتہائی عظمت ہے اور یہ یہ ہے کہ:۔

مشربِ پروانہ از آتش نداند طور را

انا الحق، وحدانیت کا بڑا بلند مرتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن "انکار" اس سے زیادہ بلند ہے، خدا کا انکار حقیقتاً عجزِ فہم کا اقرار ہے اور یہی آخری حد ہے اس کے سمجھنے کی —— دوسری بات سے آپ خود بھی واقف ہیں، صراحت کی ضرورت نہیں۔ ہاں، تو بدعا یہ کہنا ہے کہ آپ نے جس مسئلہ کو چھیڑا ہے وہ (آپ ہی کی اصطلاح میں) نہ لاہوت سے تعلق رکھتا ہے نہ ناسوت سے یعنی نہ خدا سے نہ مجھ سے۔ اس لئے میں کیا عرض کر سکتا ہوں، اور اگر کچھ کہوں بھی تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی ہے بہرحال میں اس باب میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں، لیکن اگر اس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں مخالف ہوں تو میں اس کی بھی تردید نہ کروں گا، بشرطیکہ اس کی ذمہ داری آپ اپنے سر لیں۔ میں یہ سننے کے لئے منتظر رہوں گا کہ آپ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ انتقاد و تبصرہ کی غرض سے نہیں بلکہ محض اعتبار و بصیرت کے لئے

محب گرامی۔ معاف فرمایئے جواب میں غیر معمولی تعویق ہو گئی۔ میں اس دوران میں دو چار دن غائب رہا۔ لکھنؤ سے نہیں، بلکہ خود اپنے حضور سے —— سبب کوئی خاص نہیں تھا، بلکہ وہی زندگی کے معمولی افکار و حوادث کہ اگر انھیں حیات سے علیحدہ کر دیجئے تو جینا دوبھر ہو جائے۔

آپ نے جن صاحب کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق میری رائے آپ سے بالکل مختلف ہے، آپ انھیں مغرور سمجھتے ہیں، میں خوددار کہتا ہوں، آپ بے پرواہ بتاتے ہیں، میں ضابط و متحمل کہتا ہوں۔ رہا مرتبۂ خلوص و وفا، سو اس کا حال مجھ سے نہ پوچھئے، ان کے دشمنوں سے پوچھئے۔ وہ آدمی نہیں ہے، ہیرا ہے اور ہیرا بھی "کوہِ نور" کے قسم کا۔

اس میں شک نہیں کہ تھوڑی سی "پراگندگی" ضرور ان کی طبیعت میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کا تعلق خود انھیں کے ذاتی حالات سے ہے، احباب و اعزہ سے اسے کوئی واسطہ نہیں

آپ ملئے اور بار بار ملئے، وہ دیرآشنا ضرور ہیں لیکن بداخلاق نہیں۔ جب آپ انھیں سمجھ لیں گے تو مجھ سے زیادہ ان کی تعریف کریں گے

ایک عادت ان میں ضرور ایسی ہے جو آپ کے لئے تعجب کا باعث ہو سکتی ہے، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ آپ وہاں جائیں تو تسبیح و جانماز بھی ساتھ لیکر جائیں۔ وہ اپنے گھر کو مسجد بنانے سے رہے اور آپ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے ۔۔۔ صرف بہ حیثیت انسان ہونے کے ان کا مطالعہ کیجئے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں۔ مینار اگر زیادہ بلند ہے تو نگاہ کو بھی اتنا ہی بلند کرنا پڑے گا، اگر آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

خط پہونچا۔ دنیا کا کیا ذکر، میں خود اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہوں۔ اگر صوفی ہوتا تو کہتا کہ "فنا فی الذات" کی منزل سے گزر رہا ہوں۔ مگر نہیں ہوں اس لئے صاف صاف اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم کو میری اس "گمشدگی" کا حال معلوم کیونکر ہوا۔ اب سے چھ مہینے قبل جب تم سے ملا تھا، تو کیا اسوقت بھی ایسا ہی تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر چند مہینوں میں ایسے کیا اسباب پیدا ہو سکتے ہیں کہ تم نے میرے متعلق اس بات کو باور کر لیا جو تمھیں پسند نہیں۔

کہو گے یہ بھی "آشفتہ خیالی" کی دلیل ہے کہ ایک ہی سانس میں اعتراف بھی ہے اور انکار بھی۔۔۔ ہو سکتا ہے، لیکن کم از کم تمھاری زبان سے میں یہ نہیں سننا چاہتا۔ تم تو ان لوگوں میں سے ہو کہ جسے چاہو اپنا بنا لو۔ پھر حیرت ہے کہ "پرسش حال" میں تو اتنا وقت ضایع کرو اور "چارہ گری" کے لئے کوئی قدم نہ اٹھاؤ

یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر واقعی تم مذاق نہیں کر رہے ہو، تو یہاں آؤ اور مجھے اس غار سے نکالو جس میں گرتا جا رہا ہوں۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے اگر باتیں بناتے رہو گے تو وہ وقت دور نہیں جب میں اتنی گہرائی میں پہونچ جاؤں گا کہ نہ میں تمھاری آواز سن سکوں گا اور نہ تم میری

الغرض اس میں شک نہیں کہ "آجکل آپ سے باہر ہے نظام" اس لئے اس کو اپنی محفل میں نہ بلوائیے، بلکہ خود ہی اس تک جلد پہونچئے، ورنہ دامن کا چاک گریباں کے چاک سے ملنے کے بعد آپ پہونچے بھی تو کیا!

صدیقی ۔ دستی خط پہونچا ۔ حالات معلوم ہوئے ۔ آخرکار وہی ہوکر رہا جس کا ڈر تھا، یقیناً آپ بہت غضبناک ہوں گے، لیکن اب غصہ کرنا بیکار ہے، ضرورت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ہے کہ کیا کرنا چاہئے

آپ کا یہ فیصلہ کہ اپنا دروازہ گناہگار پر ہمیشہ کے لئے بند کردیں گے اور اس کو واپس بلانے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کرینگے نہایت عاجلانہ فیصلہ ہے اور غالباً اس کے پہونچنے ہی سے پہلے آپ اس پر نظر ثانی کر چکے ہوں گے ۔

آپ کو ناگوار تو ہوگا، لیکن معاف فرمائیے، یہ نتیجہ ہے خود آپ کی غیر معمولی سختی کا۔ دنیا میں استبداد کا ہمیشہ ایک ہی انجام ہوا ہے ۔ سرکشی، بغاوت، نافرمانی! خواہ وہ مستبد ہستی آپ ہی جیسے محبت کرنے والے باپ کی کیوں نہ ہو

اس میں شک نہیں کہ تربیت کا ایک اہم جزو نگرانی و نکتہ چینی بھی ہے، لیکن "نفسیاتی" رواداریوں کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ۔ آپ نے اخلاق کا جو راہبانہ نظریہ قایم کر رکھا ہے، میں ہمیشہ سے اس کا مخالف ہوں اور اسی لئے جب آپ نے اپنے "یوسفِ گم گشتہ" کی آزادیوں کا ذکر کیا، تو میں نے ہمیشہ ہنسکر ٹال دیا ۔ لیکن آپ کی سختیاں برابر بڑھ رہی ہیں، یہانتک کہ "عدمیت" (Nihilism) نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر ہی دیا ۔ تاہم ابھی وقت ہے اور اگر آپ رواداری کے لئے آمادہ ہوں تو میں کوئی تدبیر اختیار کروں ۔

مجموعۂ استفسار و جواب
کا
تیسرا حصہ

اگست میں شایع ہوجائیگا

اس کی ضخامت بھی تقریباً ۵۰۰ صفحات ہوگی اور قیمت خریداران نگار سے عہ اور غیر خریداران سے ۱؎ علاوہ محصول ۔ تینوں جلدیں ایک ساتھ خریدنے پر محصول دفتر ادا کریگا خواہ صاحب فرمائش خریدار نگار ہو یا غیر حصۂ اول و دوم کی قیمت خریدار نگار سے فی حصہ عہ، غیر خریدار سے ۱؎، علاوہ محصول

اگر آپ نے پہلے دو حصے خریدے ہیں تو تیسرا حصہ تیاری کے بعد ذریعہ وی ۔ پی روانہ کردیا جائیگا ۔ منیجر نگار

علم الاصنام پر ایک اجمالی تبصرہ

(منجملہ چھ[1] تقریروں کے اڈیٹر نگار کی وہ پہلی تقریر جو ۱۲ر جولائی کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

اب سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال قبل کی بات ہے ۔ اُس وقت کی، جب زمین کا شباب شروع ہوا ہے اور انسان اپنے عہد درندگی کو ختم کرکے، وادیوں میں، پہاڑوں پر، کھلے میدانوں میں، دریاؤں کے کنارے نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہا ہے، زمین کھودنے، صحرائی جانوروں کا مقابلہ کرنے اور درختوں کی شاخیں کاٹ کاٹ کر جھوپڑا طیار کرنے کے لئے، پتھر کے چند اوزار و اسلحہ بھی اس کے پاس موجود ہیں اور قبایلی زندگی بسر کرنے کے میلان نے اس میں ایک نوع کا اجتماعی احساس بھی پیدا کردیا ہے۔

جذبات تو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کے اظہار کے لئے وہ الفاظ اپنے پاس نہیں رکھتا، فطرت کے گوناگوں مناظر اس کی نگاہ سے گزرتے ہیں، لیکن ان کے اظہار کے لئے وہ الفاظ اپنے پاس نہیں رکھتا، فطرت کے گوناگوں مناظر اس کی نگاہ سے گزرتے ہیں مگر ان کی حقیقت سمجھنے سے وہ معذور رہے۔ الغرض یونتو وہ ایک دنیائے تاثرات ہے لیکن چہرہ کے تغیر، اعصاب کی جنبش، جسم کی لرزش اور بے اختیارانہ چیخ یا آواز کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اظہار جذبات کا اس کے پاس نہیں ہے

دن پر دن، سال پر سال اسی حالت میں گزر جاتے ہیں، یہاں تک کہ صدیاں ختم ہوجاتی ہیں اور وہ تمدن کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے۔ یعنی اب وہ دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر نہیں رہجاتا بلکہ اپنی زبان سے بھی اپنے احساس کو ظاہر

---

[1] باقی پانچ تقریروں کی تاریخیں یہ ہیں:-

۲۶ر جولائی ——— رومہ و یونان کا علم الاصنام

۹ر اگست ——— یونان کی سب سے زیادہ دلکش روایات اصنامی

۳۰ر اگست ——— ہندؤں کا علم الاصنام

۱۳ر ستمبر ——— ویدوں کی روایات

۲۷ر ستمبر ——— غیر آریہ اقوام کا علم الاصنام

کرسکتا ہے، جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے اسے بیان کرنے کی قوت بھی اس میں پیدا ہو چلی ہے، گویا یوں سمجھئے کہ قبائلی زندگی ایک حد تک مکمل ہو کر اخلاقی حدود کے اندر آگئی ہے اور سود و زیاں کا بھی ایک دھندلا سا خاکہ اس نے اپنے ذہن میں مرتب کر لیا ہے۔

کائنات کے تغیرات، قدرت کے نت نئے مناظر، اور حوادث طبیعی سے تو آنکھ کھولتے ہی اسے واسطہ پڑا تھا، لیکن اب وہ صرف سہم کر رہ جاتا تھا بلکہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ اپنی سہمی ہوئی حالت کو ظاہر بھی کرتا تھا اور باوجود عقل کی انتہائی نارسائی کے وہ ان کے سمجھنے کی بھی کوشش کرتا تھا — پہلے اگر وہ طوفانِ باد و باراں دیکھ کر سوائے کپکپا اُٹھنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا تو اب اس کا سبب بھی ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ وہ اب چاند سورج کے طلوع و غروب کو دیکھتا تھا اور ان پر غور کرتا تھا۔ بادلوں کو اِدھر سے اُدھر گزرتے دیکھتا تھا اور اپنے تخیل میں خاص جنبش و ہیجان محسوس کرتا تھا، وہ گرج سنتا تھا اور اسکی قوتِ نطق بیتاب ہو ہو جاتی تھی گویا یوں سمجھئے کہ سوچنے کی حدود سے آگے تو وہ اب بھی نہ بڑھا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے اس کا سوچنا بالکل خاموش و ساکت ہوتا تھا اور اب وہ آواز کے ساتھ سوچتا تھا۔

پھر چونکہ اس کا یہ اظہار نتیجہ تھا محض اس کے تاثرات کا نہ کہ علمِ حقیقت کا اس لئے اس کا ذہن سب سے پہلے اپنی ہی ہستی کی طرف منتقل ہوا اور اس نے سمجھا کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے سب اسی کی طرح ذی حیات ہے اور فرق اگر ہے تو صرف صورت و شکل کا۔

اس کے بعد اس نے مناظرِ قدرت و مشاہدات کو دائرۂ گفتگو میں لانے کے لئے اپنے ماحول پر نظر ڈالی اور وہیں سے تشبیہات و استعارات لے لیکر نہایت سادگی لیکن حد درجہ پُرکاری کے ساتھ فطرت کے مظاہر و آثار کو اپنی تخلیق ادب سے متعلق کر لیا۔

یہ تھا وہ زمانہ جب دنیا میں اصنامی روایات کی ابتدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ مختلف اقوام نے اپنے اپنے ماحول کے لحاظ سے اس میں تنوع پیدا کیا، داستانیں وضع کیں اور زیب داستاں کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ایک شاعر و ادیب کی خلاقانہ ذہنیت کر سکتی تھی۔

اب، کہ علوم و فنون کی ترقی نے قدرت کے چہرے سے نقاب اُلٹ کر اس کے ایک ایک خط و خال کو نمایاں کر دیا ہے اور خیال کی لذتیں ہم سے چھین کر، حقیقت کی تلخیوں سے دوچار کر رکھا ہے، اس نوع کی روایات میں اضافہ تو ممکن نہیں، لیکن انکی چھان بین ضرور عہد حاضر کے انسان کی دلچسپی کا باعث ہے اور اسی تحقیق کا نام علم الاصنام یا متھالوجی ہے جسے مصر والے خرافیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس علم کے حدود سے یہ بحث بالکل خارج ہے کہ لوگ دیوتاؤں یا اصنام کو کیوں پوجتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ روایات اصنامی جنھیں انگریزی میں "Myths" کہتے ہیں کیوں اور کس طرح پیدا ہوئیں — سب سے پہلے جس قوم نے اس پر علمی نقطۂ نظر سے غور کیا وہ اہلِ یونان تھے۔ انھوں نے اس تحقیق کے سلسلہ میں ابتدا ہی سے یہ خیال قایم کر لیا کہ ان روایات کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت پنہاں ہے اور حکماء یونان نے اپنے اوپر قیاس کر کے یہ باور کر لیا کہ ان روایات

کے وضع کرنے والے بھی ضرور فیلسوف و حکیم تھے۔ اور یہ روایات محض کنایہ و تمثیل تھیں جن کے ذریعہ سے کوئی خاص فلسفیانہ تعلیم نشر کی گئی تھی۔

پھر اس خیال کے تحت جو جو فلسفے ان روایات سے پیدا کئے گئے وہ زیادہ تر انھیں حکماء کے خیالات کا عکس تھے جو یہ تاویلیں کرتے تھے، چنانچہ انکساغورس حکیم نے ان روایات میں بڑی زبردست نفسیاتی تعلیم پوشیدہ پائی، امپڈوکلس نے عناصر اربعہ کے رموز ان میں پنہاں دیکھے اور اسی طرح دوسرے حکماء نے اپنے اپنے نظریوں کے مطابق جدا جدا فلسفے ان میں پوشیدہ پائے۔

تاویل کا یہ فلسفیانہ طریقہ عرصہ تک یونان و دیگر ملحقہ ممالک میں جاری رہا، یہاں تک کہ ۳۰۰ سال قبل مسیح ایک شخص یوہمرس (Euhemerus) نامے پیدا ہوا۔ اس کو بحر ہند کی سیاحت کے دوران میں بعض ایسے قدیم کتبے دستیاب ہو گئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید یونان کے بہت سے دیوتا حقیقت میں اس سرزمین کے بہادر فرمانروا یا سردار تھے جو بعد کو دیوتا سمجھے جانے لگے اور اس لئے اُس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روایات اصنامی کو تاریخ قدیم سے متعلق ہو سکتی ہیں اگر ان کا غیر فطری عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ اس تاویل کا نام ہی بعد کو یوہمریت (Euhemerism) قرار پایا اور اہل یونان نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دیکر اس حد تک ثابت کر دکھایا کہ ان کے روایات اصنامی میں جس دیوتا کو جیوپیٹر یا ذیوس کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ جزیرۂ کریٹ کا بادشاہ تھا اور ہرقلس یونان کا نہایت مشہور پہلوان۔ اسی طرح اٹلیس دیوتا کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا نجومی تھا اور جنگ ٹرائے (Troy) کو اہل یونان و اہل اسپارٹا کی جنگ قرار دیا۔ ہربرٹ اسپنسر بھی اسی اسکول کا متبع تھا اور مسٹر گلیڈسٹن تو یہاں تک اس نظریہ سے مرعوب ہوئے کہ زیوس، ہیڈیس اور پوسیڈن (تین یونانی دیوتاؤں) میں انھیں تثلیث عیسویت (یعنی مسیح مریم اور روح القدس) کی جھلک نظر آنے لگی اور اس سے قبل بعض حکماء انھیں تین دیوتاؤں کو، سام، حام اور یافث قرار دے چکے تھے۔ ہندوستان میں بھی ایتی ہسک (Aitihasika) اسکول نے یہی کوشش کی کہ ویدوں کی روایات کو تاریخی حقیقت ثابت کیا جائے، مگر اس میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

الغرض روایات اصنامی کے متعلق یہی دو نظریے تھے جو نہ صرف عہد رومہ بلکہ عہد عیسوی میں بھی رائج رہے۔ البتہ رومہ کے طبقۂ رواقیون (Stoics) نے امپڈوکلس کے نظریہ کو صحیح سمجھ کر یہی تاویل پسند کی کہ روایات اصنامی میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ حقیقت ہے لیکن انداز بیان کنائی و تمثیلی ہے تاہم وہ تمام روایات کی تاویل میں کامیاب نہ ہو سکے، خصوصیت کے ساتھ ویدوں کی روایات کہ ان میں دیوتاؤں کے نام کھلم کھلا قوا فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ ان دونوں اسکولوں کی نزاع برابر قایم رہی اور صدیوں تک یوروپ اسی تذبذب میں مبتلا رہا، حتےٰ کہ انیسویں صدی کی ابتداء میں ایک شخص لوبک (Lobeck) نامے پیدا ہوا اور اس نے ان دونوں نظریوں کی تردید

کرکے ظاہر کیا کہ عہدِ قدیم کا انسان نہایت سادہ انسان تھا اور خواب و خیال ہی کو حقیقت سمجھتا تھا، اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ روایات اصنامی کی تہ میں حقیقتیں پنہاں ہیں خیال کی دوسری گمراہی ہے۔ ہمیں ان روایات کو اسی سادگی کے ساتھ پڑھ لینا چاہئے جس سادگی کے ساتھ وہ بیان کی جاتی ہیں اور ان پر زیادہ غور و فکر ذہانت کا غلط استعمال ہے۔ گویا ان کی حقیقت بالکل وہی ہے جو ایک پردہ کی تصویر کی جس کے نہ اس طرف کچھ ہے نہ اُس طرف۔ لیکن اہل مغرب نے اپنی جستجو برابر جاری رکھی اور اسی صدی میں دو بھائی جو گرم برادرس (Grimm Brothers) کے نام سے مشہور ہیں، جرمنی سے اُٹھے اور انھوں نے نہایت محنت سے مختلف ممالک کی روایات جمع کرکے ثابت کیا کہ بہت سی روایتیں تحریر میں آنے سے قبل لوگوں میں زبانی منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں اور یہ تاریخی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن بعد کو ان میں رنگ آمیزی کرکے مذہبی حیثیت دیدی گئی۔ گرم برادرس کا یہ خیال قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن ان کی تحقیقات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم انکشاف یہ ہوا کہ جس طرح سنسکرت زبان اور مغربی زبانیں متحد الجنس ہیں، اسی طرح یوروپ کی آریہ قوموں کی روایات اصنامی اور ویدوں کی روایات بھی ایک ہی ماخذ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً وینس اہلِ رومہ کی مشہور دیوی ہے جس سے تمام کاروبارِ حسن و عشق متعلق سمجھا جاتا ہے، بعد کو یہی دیوی یونانیوں کے یہاں بھی آگئی اور بعض ایسی روایتیں اس سے منسوب کردی گئیں جو اہل رومہ میں نہ پائی جاتی تھیں، لیکن اس کا اصل ماخذ سنسکرت کا لفظ وآن یا وین ہے جس کے معنے خواہش و محبت کے ہیں، چنانچہ گروآن سنسکرت میں محبت کی دعاؤں کو کہتے ہیں اور یجنا وآن محبت کی قربانیوں کو۔ سنسکرت میں وینٹا دلکش عورت کے معنے میں آتا ہے، جس سے انگلوسکسن لفظ Wyn، جرمن Wonne اور انگریزی (Winsome) نکلے ہیں۔ Venereal, Venerate اور Venery بھی اسی سے مشتق ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مشہور سازوین یا بین بھی اسی سے نکلا ہو۔

اسی طرح یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا جو خدائے خدایگان کا مرتبہ رکھتا ہے، زیوس (Zeus) یا زیوس پاٹر (Zeus Pater) ہے، اہل رومہ اسے جیوپٹر کہتے تھے، سنسکرت میں اس کا نام دیوس پتر (Dyaus Petra) ہے اور ان سب کا متحد الماخذ ہونا ظاہر ہے۔

ویدوں کی روایات میں ایک دیوتا کا نام تریتا ہے اور دوسرے کا کریسا سوا، زند اوستا میں ان کو تھراتنا اور کریسپا کہتے تھے۔ تریتا اور تھراتنا وہی ہیں جو بعد کو فریدوں ہوگئے اور کریسا سوا اور کریسپا، گرشاسپ بن گئے۔ روایات وید و زند اوستا سے معلوم ہوتا ہے کہ در پتھرا نے ازدہاک کو قتل کیا تھا۔ آپ سمجھے کہ یہ ازدہاک کیا ہے، وہی جسے ضحاک کہتے ہیں اور در پتھرا سے مراد یہاں فریدوں ہے۔ پھر فریدوں کے ہاتھ سے ضحاک کے قتل ہونے کا حال شاہنامہ میں اکثر حضرات نے پڑھا ہوگا۔ یونانیوں میں صبح کی دیوی کا نام ایوس (Eos) ہے، ہندوؤں کے یہاں اوشاس (Ushas) ہے، یونانیوں کا دیوتا ارانوس، ہندوں کا ورن (Varuna) ہے

اور اہلِ روما کا دیوتا مارس، ہندوؤں کا ماروتس ہے اور ان سب کا ہم ماخذ ہونا ظاہر ہے

الغرض مغربی اقوام اور ایرانیوں کی روایات بہت کچھ ہندوؤں کی روایتوں سے ملتی جلتی ہیں اور چونکہ یہ سب آریہ نسل کے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وسطِ ایشیا چھوڑنے سے قبل ہی بعض روایات ان میں رواج پا چکی تھیں جو بعد کو بھی ان میں قایم رہیں۔

اس جستجو و تحقیق کے سلسلہ میں ایک بات اور بہت عجیب و غریب معلوم ہوئی، وہ یہ کہ بعض الہامی مذاہب کے لٹریچر میں جو روایات پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کا سراغ انسان کے اس عہدِ وحشت تک پہونچتا ہے جب روایات اصنامی کا شاید آغاز ہی ہوا تھا مسیح سے تقریباً ۸ ہزار سال قبل مصری تمدن کا آغاز ہوتا ہے اور چھ ہزار سال قبل بابل کے تمدن کا۔ جب حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون (رامسیس ثانی) کا وجود بھی نہ تھا، لیکن کسقدر حیرت کی بات ہے کہ جو روایات توریت یا اسفارِ خمسہ میں پائی جاتی ہیں ان میں سے بعض وہی ہیں جن کے منتشر لیکن اساسی اجزاء قدیم مصری و بابلی روایات اصنامی میں نظر آتے ہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ویدوں کے اصنامی روایات اور یورپ کی اکثر اقوام کی روایات بہت کچھ متحد الماخذ معلوم ہوتی ہیں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ویدوں کی روایات کا جزوِ اعظم ان کی معنویت و روحانیت ہے اور اہلِ مغرب نے آرٹ کی حیثیت سے بجائے نفسیاتی اہمیت کے نفسانی جذبات ان سے وابستہ کر دئے۔

قدیم ترین لٹریچر خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا یونانیوں کا، اس کا مطالعہ ہمیں جس طرف لیجاتا ہے وہ وہی ہے جہاں زبان کے تحلیل و تجزیہ کے سوا اور کوئی صورت رہنمائی کی ہمیں نظر نہیں آتی۔ اور اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کی تمام قوموں میں ایک زندہ قوت کا عقیدہ مشترک طور پر پایا جاتا تھا اور وہ بہ لحاظ اختلاف مظاہر اس قوت کے مختلف نام رکھنے میں انھیں چیزوں سے مدد لیتے تھے جو ہر وقت ان کے مشاہدہ میں آتی رہتی تھیں اور یہیں سے روایات اصنامی کی بنیاد پڑتی ہے

اس میں کلام نہیں کہ یہ کوشش زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کرتی گئی، یہاں تک کہ بعض اقوام میں اس نے ایک مستقل شریعت و مذہب کی شکل پیدا کرلی اور اس کی ابتدائی صورت مفقود ہوگئی۔ پھر اس دور میں جبکہ ہر چیز علم و عقل کی کسوٹی پر کسی جارہی ہے، اصنامی مذاہب یا ان کا لٹریچر مذہبی نقطۂ نظر سے تو خیر کوئی اہمیت حاصل نہیں کرسکتا لیکن ادب و انشاء یا آرٹ کی حیثیت سے جو قیمتی معلومات اس سے حاصل ہوسکتی ہیں ان کی اہمیت بدستور قایم ہے اور رہیگی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز بھی قابلِ ذکر ہے جسے انگریزی میں (Folk-Lore) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ "گھریلو کہانیاں" زیادہ مناسب ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اس نوع کی کہانیوں کا رواج نہ ہو لیکن ان کو علم الاصنام یا روایات اصنامی سمجھنا درست نہیں ہے۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اول الذکر سے مراد صرف

وہ روایات ہیں جن میں دیوتاؤں، دیویوں، یا خداؤں کا ذکر پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان قدیم نے خدا کے تصور کو کن کن مادی صورتوں میں پیش کیا اور گھریلو کہانیاں زیادہ تر اُن واقعات و تاثرات کا نتیجہ ہیں جو انسان کو اُس کی روز کی زندگی میں پیش آتے تھے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ کہانیاں انسان قدیم کی معاشرت و معیشت تہذیب و کلچر سے متعلق تھیں یا پھر اُن اوہام و قیاسات سے جو بربنائے لاعلمی قایم کئے جاتے تھے اس میں انسان کا تفریحی عنصر بھی شامل تھا اور مذہبی عنصر بھی، شاعرانہ میلان بھی شامل تھا اور اخلاقی رجحان بھی۔

فوک لور کا لفظ سب سے پہلے ۱۸۴۶ء میں ایک شخص ٹامس نامے نے استعمال کیا اور اسی وقت سے اسکی چھان بین شروع ہوئی، یہاں تک کہ اب بالکل علم الآثار کی طرح اسکی بھی مختلف کڑیاں جوڑ جوڑ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ انسان قدیم کی تہذیب و شائستگی یا عقاید کا سراغ کس حد تک ان کے ذریعہ سے چلایا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قصہ گوئی انسان قدیم کا بھی نہایت دلچسپ مشغلہ رہا ہے اور اس ذریعہ سے اس نے بہت سی اصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں، چنانچہ آج بھی اقوام عالم کے اصلاحی لٹریچر میں ان کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ پنچ تاتر، کلیلہ دمنہ، سرت ساگر، الف لیلہ، ایسپ فیبلس (Aesop's Fables) سب اسی لٹریچر میں شامل ہیں، بلکہ فریدالدین عطار کا منطق الطیر، سعدی کی گلستان، جامی کی بہارستان اور مثنوی مولانائے روم کی اکثر حکایات اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں جنھوں نے انسانی اخلاق کی تعمیر میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ مختلف قوموں اور طبقوں کی ذہنیت و تعلیم کے لحاظ سے یہ کہانیاں بھی مختلف درجہ کی ہیں، چنانچہ سب سے زیادہ سادہ و معصوم وہ کہانیاں ہیں جو عام طور پر مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو سناتی رہتی ہیں اور ہمارے ہندوستان میں چڑے چڑیا کی کہانی اور چاند کی بڑھیا کی داستان اس سلسلہ کی خاص چیزیں ہیں۔ لیکن آپ یہ سنکر غالباً تعجب کریں گے کہ یہ کہانیاں صرف ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ یوروپ و ایشیا کی بہت سی قوموں میں تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ رائج ہیں اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے ابتدائی سادہ دور میں کیسی یکساں ذہنیت رکھتا تھا اور بعد کو ماحول کے اختلاف نے اس کی قوت فکر و خیال میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کئے۔ ہرچند اس میں شک نہیں کہ گھریلو کہانیاں روایات اصنامی کے بعد پیدا ہوئیں، لیکن چونکہ ان دونوں کا ماخذ وہی انسان کی ابتدائی لاعلمی ہے جب وہ مناظر قدرت اور حوادث روزگار کو قیاس و خیال کی انتہائی سادگی مگر نہایت دلکش کنایہ و تمثیل کے ساتھ سمجھنے اور بیان کرنے پر مجبور تھا، اس لئے یہ دونوں ذریعے ہمیں اسی نتیجہ پر پہونچاتے ہیں کہ وہ اصنامی روایات ہوں یا گھریلو کہانیاں، ہیں سب انسان کے ابتدائی شعور کی یادگار، جب طلوع و غروب، موسموں کے تغیر، طوفان باد و باراں اور زلزلہ وغیرہ سے متاثر ہوکر وہ اپنے جذبات مسرت و غم ایک خاص زبان میں ادا کیا کرتا تھا لیکن انسان قدیم کی یہ شاعری زمانۂ حال کے انسان کی شاعری نہ تھی کہ حال کچھ ہے اور قال کچھ بلکہ جو کچھ وہ کہتا تھا اسے سچ سمجھتا تھا اور اسی سچ کے سامنے اپنا سر عقیدت جھکا دیتا تھا۔